ادب

کس کا، کیوں اور کیسے؟

عام فہم اسلوب، مؤثر انداز، مستند واقعات

- اللہ تعالیٰ کا ادب
- رسول اللہ ﷺ کا ادب
- قرآن مجید کا ادب
- احادیث کا ادب
- صحابہ و اہل بیت رضی اللہ عنہم کا ادب
- حرمین شریفین اور مساجد کا ادب
- ائمہ محدثین و فقہاء کا ادب
- اولیائے کرام کا ادب
- علمائے کرام کا ادب
- والدین کا ادب
- اساتذہ کرام کا ادب
- بڑوں کا ادب

مؤلفین

مولانا حکیم محمد ادریس فاروقی رحمہ اللہ

محمد نعمان فاروقی

www.KitaboSunnat.com

مسلم پبلیکیشنز

تاسیس: مولانا حکیم عبدالمجید سوہدروی بنام "مسلمان کمپنی" 1921ء
بانی و مدیر ہفت روزہ "مسلمان"

تجدید: مولانا حکیم محمد ادریس فاروقی بنام "مسلم پبلی کیشنز" 1970ء
بانی و سابق چیف ایڈیٹر ماہنامہ ضیائے حدیث، لاہور

کتاب:

ادب

کس کا کیوں اور کیسے؟

تالیف:

مولانا حکیم محمد ادریس فاروقی رحمہ اللہ

محمد نعمان فاروقی

ایڈیشن:

اگست 2015ء

ہماری کتب مل سکتی ہیں
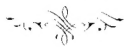
لاہور: ❁ 36 لوئر مال، دار السلام
دار السلام، ڈیفنس، دار السلام،
پیکو روڈ، دار السلام اردو بازار
❁ مکتبہ اسلامیہ، اردو بازار
❁ کتاب سرائے، اردو بازار
فیصل آباد: ❁ مکتبہ اسلامیہ، کوتوالی روڈ
❁ مکتبہ اہلحدیث، امین پور بازار
گوجرانوالہ: ❁ نعمانی کتب خانہ، اردو بازار
❁ حدیبیہ، پیپلز کالونی
راولپنڈی: ❁ مکتبہ عائشہ، کمیٹی چوک
کراچی: ❁ دار السلام، مین طارق روڈ
❁ فضلی سنز، اردو بازار
اسلام آباد: ❁ دار السلام، F8 مرکز
گجرات: ❁ دار الایمان، نزد فوارہ چوک
کوئٹہ: ❁ مکتبۃ الہدیٰ،
شیرانی مارکیٹ آرچر روڈ
سیالکوٹ: ❁ الفرقان، بانو بازار متصل اردو بازار
ڈسکہ: ❁ لاہور کتاب میلہ، کالج روڈ

• 12 عثمان غنی روڈ، سنت نگر، لاہور 042-37249678
• 25 ہادیہ حلیمہ سنٹر، اردو بازار، لاہور 042-37310022
0322-4044013 | 0321-4259678

اللہ کے نام سے (شروع) جو نہایت مہربان بہت رحم کرنے والا ہے۔

فہرست

عرض ناشر ومؤلف

ادب آداب کی ہر سطح پر بہت اہمیت ہے۔ ادب سے عاری انسان اپنا مقام نہیں بنا سکتا۔ با ادب بامراد اور بے ادب بے مراد ہوتا ہے۔ ادب سے محروم لوگ کچھ حاصل نہیں کر پاتے۔ مگر جب ادب کی بات آتی ہے تو اس موضوع پر سرے سے اللہ تبارک وتعالیٰ کا نام ہی نہیں آتا۔ انبیائے کرام اور رسل عظام علیہم السلام کا ادب اس لیے کہ وہ اللہ کے رسول اور نبی ہیں، قرآن مجید کا ادب اس لیے کہ وہ اللہ کی کتاب ہے، اولیائے کرام کا ادب اس لیے کہ وہ اللہ کے ولی ہیں مگر اللہ تعالیٰ کے ادب کے موضوع پر سرے سے بات ہی نہیں ہوتی۔

اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے والد گرامی مولانا حکیم محمد ادریس فاروقی رحمہ اللہ نے اپنے جاری کردہ رسالے ماہنامہ ضیائے حدیث لاہور میں ''ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں'' کے عنوان سے لکھنے کا آغاز کیا۔ اور ادب الٰہی پر بہت سے نکات ارقام فرمائے۔ انھوں نے 3 قسطیں لکھی تھیں جس میں سے دو شائع ہو چکی تھیں۔ راقم ضیائے حدیث کا ایڈیٹر تھا۔ میں نے والد صاحب مرحوم سے عرض کی کہ یہ عنوان تو بہت طویل ہے اب آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب پر لکھیں۔ انھوں نے میری درخواست قبول کی اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب پر مضمون لکھ دیا۔ یہی مضمون ان کی زندگی کا آخری مضمون بن

گیا۔ وفات سے ایک دن قبل انھوں نے اس کی پروف ریڈنگ اور ایڈیٹنگ مکمل کی تھی۔ انھوں نے اس مضمون میں یہ شعر بھی درج کیا تھا ؎

زندگیاں بیت گئیں اور قلم ٹوٹ گئے
مگر تیرے اوصاف کا اک باب بھی پورا نہ ہوا

یہ شعر اس مضمون میں انتہائی مناسب معلوم ہوتا ہے جیسا کہ قارئین پڑھ لیں گے۔
اور اس مضمون کے آخر میں مولانا ظفر علی خان مرحوم کا یہ شعر تھا ؎

جو کرنی ہے جہانگیری محمدؐ کی غلامی کر
عرب کا تاج سر پہ رکھ خداوندِ عجم ہو جا

والد گرامی رحمہ اللہ کو رسول اللہ ﷺ سے از حد عقیدت تھی۔ کئی خطبات و دروس میں میں نے خود ان کی پرنم آنکھیں دیکھیں اور ان کی ہچکی بندھتے دیکھا۔ نجی مجالس میں ذکر حبیب ﷺ سے آپ کی آنکھیں اشکبار ہو جایا کرتیں۔ آپ کو خواب میں رسول اکرم ﷺ کی زیارت بھی نصیب ہوئی تھی۔ مگر انھوں نے قطعاً اسے اپنی تشہیر کا ذریعہ نہ بنایا اور اسے ایک عظیم سعادت سمجھ کر ایک راز ہی رکھا۔

والد گرامی رحمہ اللہ کو کئی اور ائمہ اور شخصیات کی زیارت بھی ہوئی تھی۔ انھوں نے اپنے خواب قلمبند کیے تھے۔ میں ایک دن ان سے عرض کرنے لگا: ابو جان! آپ نے جہاں خواب میں آنے والی شخصیات کا تذکرہ کیا ہے وہاں رسول اللہ ﷺ کی زیارت والے خواب کا تذکرہ بھی کر دیں۔ فرمانے لگے: نہیں میرا بیٹا! رسول اللہ ﷺ کی عظمت اس سے بہت زیادہ ہے کہ آپ علیہ السلام کا تذکرہ امتیوں کے تذکرے کے ساتھ کیا جائے۔

ان کے ہاں ادب نبوی کی یہ ایک مختصر سی جھلک تھی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ سعادت ان کے حصے میں آئی کہ ''مقام رسالت علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام'' کے نام سے اپنی کتاب پر

عرضِ ناشر

کام کرتے ہوئے وہ اس دنیا سے رخصت ہوئے۔

والدِ گرامی رحمہ اللہ کے بعد ان کے اس سلسلے کو راقم نے آگے بڑھانے کی کوشش کی اور بہت سے مزید عنوان شامل کیے۔ الحمد للہ علی ذلک۔

بعد ازاں ان مضامین کو جمع کر کے ان کی ترتیب لگائی، ان پر مزید کام کیا، بہت سے مقامات پر اضافے کیے اور اسے مرتب انداز اور عوامی اسلوب میں ڈھالنے کی کوشش کی تاکہ عوام کے اندر یہ شعور بیدار ہو کہ ہمیں کس کا ادب کیوں اور کیسے کرنا ہے اور سوءِ ادبی کی صورتوں سے کس طرح بچنا ہے۔ امید ہے ہماری یہ ادنیٰ سی کاوش اپنے مقصد میں کامیاب رہے گی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اسے اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے۔ اور روزِ قیامت لواء الحمد کے نیچے ہم سب کو جمع فرمائے۔ آمین۔

آخر میں میں رفیقِ ادارہ حافظ فاروق عبداللہ حفظہ اللہ، حافظ سیف اللہ لغاری حفظہ اللہ محترم رمضان شاد، وسیم کیلانی اور عبدالخالق صاحبان کا شکر گزار ہوں جن کی محنتوں سے یہ کتاب طباعت کے مرحلے تک پہنچی۔

علاوہ ازیں اپنے بھائیوں، بہنوں، اہلیہ اور خصوصاً والدہ صاحبہ کا شکر گزار ہوں جو ہر وقت میری کامیابی کے لیے دعا گو رہتی ہیں۔

محمد نعمان فاروقی

ڈائریکٹر: مسلم پبلی کیشنز، لاہور

رجب 1436ھ/ اپریل 2015ء

باب: 1

ادَب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں

ادب کا معنی ومفہوم

دین ہو یا دنیا اس میں ادب کو خاص مقام حاصل ہے۔ ہر موڑ پر ادب کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ادب سے مراد کسی بھی کام کا قرینہ، سلیقہ، اچھا طریقہ اور قابل تحسین انداز ہے۔ اور اس کا مظاہرہ ہر وقت، ہر جگہ ہر ایک سے ہوتا ہے۔ جو ان باتوں کا بطور خاص خیال رکھے، با ادب کہلاتا ہے۔ اور جو ان خوبصورت باتوں سے استغنا برتے اور کسی قاعدے کلیے کی پروا نہ کرے، بے ادب شمار ہوتا ہے۔ عربی مقولہ ہے:

لَا مِيرَاثَ كَالْأَدَبِ.

''ادب جیسی کوئی میراث نہیں۔''

یہ بھی کہتے ہیں:

اَلْأَدَبُ جُنَّةٌ لِلنَّاسِ.

''ادب لوگوں کے لیے ڈھال ہے۔''

جُنَّةٌ عربی زبان میں ڈھال کو کہتے ہیں۔ ادب کو ڈھال اس لیے کہا گیا ہے کہ اس کی بدولت ذلّت اور خجالت سے بچا جاتا ہے۔ امام غزالی رحمہ اللہ دین کے حوالے سے فرماتے ہیں:

اَلدِّيْنُ كُلُّهٗ أَدَبٌ.

”دین سب کا سب ادب ہے۔“

مطلب یہ کہ دین کی ہر بات ہمیں ادب سکھاتی ہے۔ اور اس کی جملہ تعلیمات و ہدایات مبنی براَدب ہیں۔

”ادب“ اپنی جگہ ایک وسیع موضوع ہے جو بڑا جامع مفہوم رکھتا ہے۔ کیونکہ ایک ادب خالق کا ہے۔ ایک ادب مخلوق کا ہے۔ اور مخلوق میں پھر مختلف مدارج ہیں۔ انبیاء علیہم السلام، اولیاء اور ائمہ رحمہم اللہ وغیرھم۔ ان کا اپنی اپنی جگہ ادب ضروری ہے۔ بلکہ اگر وسیع نظر سے دیکھا جائے تو ملائکہ، آسمانی کتابوں، مرسلین علیہم السلام، اہل بیت رضی اللہ عنہم، صحابہ رضی اللہ عنہم، ائمہ رحمہم اللہ، اولیا رحمہم اللہ، امراء، والدین، اساتذہ، علما، سنّ رسیدہ، ہم عمر و ہم پیشہ ساتھیوں اور ہمسایوں غرض سب کا ادب بجالانا ضروری ہے۔

ہمارا مروّجہ طریقہ

ہمارے ہاں جب ادب کی بات ہوتی ہے تو عموماً نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ائمہ و اولیاء رحمہم اللہ کے ادب تک ہی بات کو مرتکز رکھا جاتا ہے۔ یعنی ادب کا موضوع حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے شروع کر کے اولیاء پر ختم کر دیا جاتا ہے۔ ان کے آداب میں بھی چند باتوں، کو ادب باور کرا کے بات سرے تک پہنچا کر فارغ ہو بیٹھتے ہیں۔ اور یہ تصور پیش کیا جاتا ہے کہ جو لوگ ان باتوں کو مانتے ہیں وہ ان ہستیوں کا ادب بجالاتے ہیں۔ اور اس کے برعکس، جو نہیں مانتے وہ ان ہستیوں کے بے ادب ہیں۔ جبکہ ان پر خواہ مخواہ اصرار خلافِ ادب ہے۔ ادب دین کے مطابق عقیدہ و عمل اختیار کرنے کا نام ہے نہ کہ دین کے الٹ چلنے کا نام ہے۔ مثال کے طور پر ایک بات نبی علیہ السلام نے فرمائی نہیں، صحابہ و اہل بیت رضی اللہ عنہم

نے بتلائی نہیں، ائمہ رحمہم اللہ نے اپنائی نہیں۔ بھلا سوچو تو سہی وہ کیونکر ادب یا دین کا حصہ ہوسکتی ہے؟ غلط عقائد و افکار کا بھی قریب قریب یہی حال ہے۔

مصنوعی اور حقیقی ادب

قارئین! یہ نہ بھولیے ایک مصنوعی ادب ہوتا ہے اور ایک حقیقی ادب۔ ان دونوں میں بڑا فرق ہے، مثلاً: مصنوعی ادب محض دعوے کرنا ہے۔ جبکہ حقیقی ادب اُسوۂ رسول ﷺ اپنانا ہے۔ کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ ان دونوں میں فرق نہیں ہے؟ ایک شخص جھنڈیاں لگاتا، جھنڈے لہراتا، پہاڑیاں بناتا اور اشعار پُر ترنّم سناتا ہے مگر داڑھی منڈاتا اور کتراتا، مونچھیں بڑھاتا اور بیاہ شادی پر ڈھول باجے بجاتا، ناچتا اور گاتا ہے، خود کہیے وہ کون سا ادب بجالا رہا ہے؟ ایک ہفتے میلاد مناتا ہے اور اگلے ہفتے ریکارڈنگ لگا کر لوگوں کا دم ناک میں کر دیتا بلکہ شریعت کا منہ چڑاتا ہے۔ ہم سمجھ نہیں سکے کہ یہ ادب کی کون سی نوع ہے جسے وہ اپنا رہا ہے؟

ایک نکتہ

ادب کی جب بات آتی ہے تو مقام حیرت و افسوس ہے کہ ربِ جَلّ وعلا کے ادب سے کیوں استغنا برتا جاتا ہے؟ ہمارے جو دوست نبی کریم ﷺ سے ادب کی بات شروع کرتے ہیں وہ اس ادب کا اللہ تعالیٰ سے آغاز کیوں نہیں کرتے؟ کیا ہمیں اللہ تعالیٰ کے ادب کی ضرورت نہیں رہی؟ کیا ہم نے اسے ضروری نہیں سمجھا؟ کیا ہم نے اپنی اس کوتاہی کا کبھی احساس کیا ہے؟ اگر پہلے احساس نہیں کیا تو اب ہی کرلیں۔ یہ مضمون اسی یاددہانی کے لیے ہدیۂ قارئین کیا گیا ہے۔ حالانکہ بابِ ادب میں آغاز اللہ تعالیٰ سے کرنا چاہیے۔ سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر اللہ مالک الملک کے

ادب کا تذکرہ بلکہ چرچا ہونا چاہیے۔ کیونکہ سب شخصیتوں کا ادب اسی کا رہینِ منت ہے۔ یعنی سب کا ادب اسی معبود حقیقی کی وجہ سے کیا جاتا ہے۔ اگر نبی ہے تو اللہ کا، ولی ہے تو اللہ کا، عابد ہے تو اللہ کا، گویا اللہ کے تعلق ہی کی بنا پر سب کو کمال حاصل ہوا۔ اس کے تعلق کے بغیر کسی کا اپنا اور ذاتی کوئی کمال نہیں۔ سب کے کمالات اللہ کے عطا کردہ ہیں۔ جب حقیقت یہ ٹھہری تو پھر سب سے اوّل اللہ تعالیٰ جلَّ مجدہٗ ہی سے بیان ادب کا آغاز کیوں نہ کیا جائے؟ بلکہ کرنا چاہیے۔ جس طرح حضرت رسول اکرم ﷺ کی شان میں بے ادبی کر کے اللہ کے ادب کا کوئی فائدہ نہیں، ٹھیک اسی طرح اللہ کی شان میں بے ادبی کا ارتکاب کر کے رسول اللہ ﷺ کے ادب کا بھی مطلق فائدہ نہیں۔ بلکہ یہ خود منشائے رسول ﷺ کے سراسر منافی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ ادب خود حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے کیا اور ایسا کیا کہ حق ادا کر دیا۔ آپ ﷺ سے بہتر اللہ کا ادب کسی نے کیا ہے نہ کر سکتا ہے۔

پہلا ادب اللہ جَلَّ مجدہٗ کا

انسانوں میں سب سے اونچا مرتبہ حضرات انبیاء علیہم السلام کا ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ ان کے دل میں سب سے بڑھ کر ادب و احترام اللہ تعالیٰ کا تھا۔ وہ ہمیشہ اسی کے گیت گاتے، اسی کے ڈنکے بجاتے، اسی کی توحید سناتے اور اسی کے پھریرے لہراتے تھے۔ انبیاء علیہم السلام کے ادب الٰہی کا نمونہ ملاحظہ ہو:

ــ حضرت آدم علیہ السلام جب جنت سے زمین پر آ گئے۔ کیوں آ گئے؟ اس کا ذکر سورۂ بقرہ کی آیت نمبر 36 میں ہے:

﴿فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا...﴾

''شیطان نے آدم وحوا علیہما السلام کو (جنت سے) بہکا کر نکلوا دیا۔''

فرمایا:

﴿فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ﴾

''آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ لیے۔ اور اللہ نے ان کی توبہ قبول فرمائی۔ بے شک وہی بہت توبہ قبول کرنے اور رحم کرنے والا ہے۔''[1]

ان کلمات کا ذکر سورۂ الاعراف 23:7 میں ہے جن کا ایک ایک لفظ ادبِ الٰہی کا

[1] البقرۃ 36:2.

کمال درجہ عکاّس وغماز ہے۔ آدم وحوا علیہما السلام نے بڑے ہی عجز وانکسار سے عرض کیا:

﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾

''اے ہمارے رب! ہم نے اپنے اوپر بہت ظلم کیا۔ اگر آپ نے ہماری بخشش نہ کی اور ہم پر رحم نہ کیا، تو ہم زیاں کاروں میں ہو جائیں گے۔''

دیکھا، حضرت آدم وحوا کے کس قدر باادب جملے تھے؟

- حضرت نوح علیہ السلام پر توحید کی پاداش میں جب سختیاں حد سے بڑھ گئیں تو اپنے قادر و قیوم رب کی بارگاہ میں بڑی ہی لجاجت سے عرض پذیر ہوئے:

﴿فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ﴾

''آپ علیہ السلام نے اپنے رب کو پکارا کہ میں بے بس ہوں تُو ہی انتقام لے۔''[1]

- جب توحید کے جرم میں کفار ومشرکین نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دھمکی دی تو آپ نے عراق (بابل) سے شام کی طرف ہجرت کا ارادہ کر لیا۔ اور جو کچھ کہا وہ قرآن مجید نے بیان کیا:

﴿وَقَالَ اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ○ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ﴾

''اور کہا میں ہجرت کر کے اپنے پروردگار کی طرف جانے والا ہوں۔ وہ جلد میری رہنمائی فرمائے گا۔ (کہا) اے میرے رب! مجھے نیک بخت اولاد عطا فرما۔''[2]

- حضرت یوسف علیہ السلام: آپ ربِّ قدوس کی بارگاہ میں عرض پذیر ہوئے:

﴿فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ تَوَفَّنِيْ

[1] القمر 10:54. [2] الصّٰفّٰت 37:99-100.

﴿مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ﴾

"اے زمین و آسمان کے خالق! آپ دنیا اور آخرت میں میرے کارساز ہیں۔ آپ مجھے پوری فرمانبرداری کی حالت میں اٹھا لیجیے۔ اور مجھے نیک بندوں میں شامل فرما لیجیے۔"[1]

- حضرت ایوب علیہ السلام: آپ طویل عرصہ اور بقول بعض اٹھارہ برس بیمار رہے، لیکن آپ نے اپنے سچے مشکل کشا کا دروازہ نہ چھوڑا۔ قرآنِ مجید نے آپ کی تکلیف اور دعا کا یوں ذکر کیا:

﴿وَاَیُّوْبَ اِذْ نَادٰی رَبَّهٗۤ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ﴾

"اور ایوب علیہ السلام کی اس حالت کو یاد کرو جبکہ انہوں نے اپنے رب کو پکارا کہ مجھے بیماری نے آلیا ہے۔ اور آپ ارحم الراحمین ہیں۔"[2]

- حضرت یونس علیہ السلام: آپ نے شکم ماہی میں بلاوسیلہ براہ راست اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کی۔ اور دنیا کو بتا دیا کہ مشکل کشا کون ہے۔ اور اس کا صحیح ادب کیا ہے، چنانچہ رب کی بارگاہ میں عرض پرداز ہوئے:

﴿وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَیْهِ فَنَادٰی فِی الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ﴾

"اور مچھلی والے (محبوب یعنی یونس علیہ السلام) کو یاد کرو، جبکہ وہ غصہ سے چل دیے۔ اور خیال کیا، ہم انہیں نہ پکڑ سکیں گے۔ وہ تاریکیوں کے اندر سے پکار اٹھے (اے رب!) آپ کے علاوہ کوئی معبود (یعنی مشکل کشا) نہیں، آپ ہر عیب

---

[1] یوسف12:101. [2] الأنبیآء21:83.

سے پاک ہیں، بے شک میں ہی ظالموں میں سے ہو گیا۔" (حالات خواہ کیسے ہوں، اپنے "اِلٰہ" سے کسی صورت رابطہ منقطع یا کمزور نہ ہونے دینا چاہیے۔)[1]

یہ ادب کا پہلا زینہ ہے۔

حضرت زکریا علیہ السلام: آپ علیہ السلام نے انتہائی الحاح وزاری سے اللہ تعالیٰ کے حضور سبد میں ادب وانکسار کے پھول سجا کر پیش کیے۔ قرآن مجید کی زبان میں ملاحظہ کیجیے:

﴿وَ زَكَرِيَّآ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا وَّ اَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ﴾

"اور زکریا کو یاد کرو جبکہ انھوں نے اپنے رب سے دعا کی کہ اے میرے پروردگار! مجھے تنہا نہ چھوڑ، تو سب سے بہتر وارث ہے۔"[2]

حضرت ہود علیہ السلام:

﴿وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ﴾

"اور ہم نے قوم عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔ انہوں نے کہا: اے میری قوم! تم اللہ کی عبادت کرو۔ اس کے سوا کوئی تمہارا معبود نہیں۔ کیا تم نہیں ڈرتے؟"[3]

حضرت صالح علیہ السلام: اللہ کا سب سے بڑا ادب توحید خالص ہے۔ آپ علیہ السلام کا تابندہ و درخشندہ پیغام پڑھیے:

﴿وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾

"اور ہم نے ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح علیہ السلام کو بھیجا۔ انہوں نے کہا:

① الأنبيآء 87:21. ② الأنبيآء 89:21. ③ الأعراف 65:7.

اے میری قوم! تم اللہ کی عبادت کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے واضح دلیل آ چکی ہے۔''[1]

حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا:

﴿يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ﴾

''انہوں نے کہا: اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔''[2]

دیکھا آپ نے حضرات انبیاء علیہم السلام کا طرز تکلم اور انداز تخاطب ادب وعقیدت کے حوالے سے باہم کس قدر مقاربت رکھتا ہے؟

حضرت داود علیہ السلام نے فرمایا:

﴿وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ ○ فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ ○﴾

''اور خیال آیا داود کو کہ ہم نے انھیں آزمایا۔ پھر مدد طلب کرنے لگے اپنے رب سے۔ اور عاجزی کرتے ہوئے گر پڑے اور (پوری طرح) رجوع کیا۔ پھر ہم نے انھیں معاف کر دیا۔ یقیناً وہ ہمارے نزدیک بڑے مرتبے والے اور بہترین ٹھکانے والے ہیں۔''[3]

حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا:

﴿رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ﴾

---

[1] الأعراف 73:7۔ [2] الأعراف 85:7۔ [3] صٓ 38:24-25.

”اے میرے رب! مجھے بخش دے۔ اور مجھے ایسا ملک عطا فرما جو میرے سوا کسی شخص کے لائق نہ ہو۔ بلاشبہ تو بڑا ہی عطا کرنے والا ہے۔“[1]

قارئین! توجہ فرمائی آپ نے؟ کہ انبیاء علیہم السلام کس طور پر اللہ مالک الملک کے حضور سراپا انکسار وادب بنے ہوئے ہیں؟ اور کس طرح اس داتا کے سامنے لجاجت کر رہے ہیں؟

حضرت سلیمان علیہ السلام کی یہ دعا بھی بڑی پیاری ہے:

﴿رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰهُ وَاَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِكَ فِیْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِیْنَ﴾[2]

”اے میرے رب! مجھے ہمیشہ اپنی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی توفیق دیجیے۔ جو آپ نے مجھے اور میرے والدین کو عطا کیں۔ اور اس بات کی بھی توفیق دیجیے کہ میں آپ کی پسند کے نیک کام کروں۔ جن سے آپ راضی ہوں۔ اور مجھے اپنی رحمت سے نیک بندوں میں شامل فرما لیجیے۔“

- خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم: جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم جامع تھے اسی طرح آپ کا کلام بھی جامع ہے اور رب تعالیٰ سے آپ نے جو بھی دعا یا درخواست کی اس کا ایک ایک لفظ ادب ومحبت میں ڈوب کر پیش کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر لفظ موتیوں کی طرح چمک رہا ہے۔ اللہ کرے ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی اللہ تعالیٰ کے ادب وشوق کا نمونہ سیکھ لیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بارگاہِ لم یزل میں سراپائے عجز ونیاز بن کر مختلف پیرایوں میں عرض گزار ہیں:

1 ﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ

[1] صٓ 35:38۔ [2] النمل 19:27.

النَّارِ﴾

''اے ہمارے رب! ہمیں دنیا اور آخرت میں بھلائی عطا فرما اور ہمیں آگ کے عذاب سے محفوظ فرما۔''[1]

سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اکثر یہ (مذکورہ) دعا مانگا کرتے تھے۔[2]

2 ﴿رَبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا﴾

''اے میرے رب! میرے علم میں اضافہ فرما۔''[3]

اور حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا مذکور ہے:

((اَللّٰهُمَّ انْفَعْنِي بِمَا عَلَّمْتَنِي وَعَلِّمْنِي مَا يَنْفَعُنِي وَزِدْنِي عِلْمًا))

''اے اللہ! جو مجھے سکھلائیں اس کا مجھے نفع دیجیے اور مجھے وہی سکھلایئے جو مجھے فائدہ دے۔ اور میرے علم میں اضافہ فرمایئے۔''[4]

3 ﴿اَللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾

''اے اللہ! تو مالک ہے تمام جہان کا، دیتا ہے بادشاہی جسے چاہتا ہے۔ اور چھین لیتا ہے بادشاہی جس سے چاہتا ہے۔ تو جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے رسوا کر دیتا ہے۔ تیرے ہاتھ میں ہر طرح کی خیر ہے۔ بے شک

---

[1] البقرة 2:201۔ [2] صحيح البخاري، الدعوات، باب قول النبي ﷺ: ﴿ربنا آتنا...﴾، حديث: 6389۔ [3] طٰه 20:114۔ [4] سنن ابن ماجه، السنة، باب الانتفاع بالعلم...، حديث: 251 صحيح.

تو ہر چیز پر قادر ہے۔''[1]

غزوۂ بدر کے موقع پر چھپر کے نیچے الحاح وزاری سے یہ دعا کی:

اَللّٰھُمَّ! إِنْ تَھْلِكْ ھٰذِهِ الْعِصَابَةُ مِنْ أَھْلِ الْإِسْلَامِ لَا تُعْبَدْ فِي الْأَرْضِ.

''اے اللہ! اگر مسلمانوں کی یہ جماعت ہلاک ہوگئی تو پھر زمین پر آپ کی عبادت نہ ہوگی۔''

اس دعا کے دوران آپ ﷺ کے مبارک شانوں سے چادر مبارک گر رہی تھی۔ یہ کیفیت دیکھ کر سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آپ ﷺ سے لپٹ گئے اور عرض کیا:

حَسْبُكَ یَا رَسُولَ اللّٰهِ! فَقَدْ أَلْحَحْتَ عَلٰی رَبِّكَ.

''حضور ﷺ! یہ دعا آپ کو کافی ہے۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں آہ و زاری کی انتہا فرما دی ہے۔''[2]

آیات قرآنی کا نزول ہوا:

﴿إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُم بِأَلْفٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُرْدِفِينَ﴾

''اس وقت کو یاد کرو جبکہ تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے تمہاری فریاد سن لی کہ میں تمہیں ایک ہزار فرشتوں سے مدد دوں گا جو سلسلہ وار چلے آئیں گے۔''[3]

[1] آل عمران 26:3۔ [2] صحيح البخاري، الجهاد، باب ما قيل في الدرع، حديث: 2915، و صحيح مسلم، الجهاد، باب الإمداد بالملائكة، حديث: 1763۔ [3] الأنفال 9:8.

اور اسی فتح و نصرت کا اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں ذکر فرمایا:

﴿وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّ اَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾

''اور البتہ تحقیق اللہ نے بدر میں تمہاری مدد کی جبکہ تم بہت کمزور تھے۔ (یعنی مسلمانوں کی تعداد قلیل اور عالم بے سروسامانی کا تھا۔) پس اللہ سے ڈرو تاکہ تم شکر کرو۔''[1]

5 آں سرور ﷺ کو جب بھی کوئی پریشانی لاحق ہوتی تو آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یوں ملتجی ہوتے:

((يَا حَيُّ يَا قَيُّومُ بِرَحْمَتِكَ أَسْتَغِيثُ))

''اے زندہ اور قائم! میں تیری رحمت کے وسیلے سے تجھ سے فریاد کرتا ہوں۔''[2]

بھلا اللہ تعالیٰ کے علاوہ ہے بھی کون جس سے فریاد کی جائے؟

6 آنحضرت ﷺ کے کچھ اذکار اور دعاؤں کا ''مشتے نمونہ از خروارے''[3] ملاحظہ ہو جن کا ایک ایک لفظ موتیوں سے تولنے کے قابل ہے بلکہ اتنا قیمتی کہ کوئی قیمت ہی ادا نہیں کی جا سکتی۔ نمونۃً الفاظ ملاحظہ ہوں:

﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَ هَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ﴾

---

[1] آل عمران 3:123۔ [2] جامع الترمذي، الدعوات، باب قول يا حي يا قيوم...، حديث: 3524 ''حسن''۔ [3] بڑے ڈھیر میں سے چند دانے یا جیسے اردو میں کہتے ہیں: ''دیگ میں سے چند چاول۔''

''اے ہمارے رب! بعد اس کے کہ آپ ہمیں ہدایت دے چکے ہیں، ہمارے دل ٹیڑھے نہ کیجیے۔ اور آپ ہمیں اپنی طرف سے رحمت عطا فرمائیے۔ بلاشبہ آپ بڑے عطا فرمانے والے ہیں۔''[1]

اور آپ ﷺ کی یہ دعا بھی کتنی روح پرور ہے:

﴿رَّبِّ اَدۡخِلۡنِیۡ مُدۡخَلَ صِدۡقٍ وَّ اَخۡرِجۡنِیۡ مُخۡرَجَ صِدۡقٍ وَّ اجۡعَلۡ لِّیۡ مِنۡ لَّدُنۡكَ سُلۡطٰنًا نَّصِیۡرًا﴾

''اے میرے رب! مجھے جہاں لے جا اچھی طرح لے جا۔ اور جہاں سے نکال اچھی طرح نکال اور میرے لیے اپنے پاس سے غلبہ اور امداد مقرر فرما۔''[2]

مؤلف رحمہ اللہ نے انبیائے کرام علیہم السلام کی دعاؤں کا تذکرہ کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام اللہ کے حضور کس قدر عجز و نیاز کا اظہار کر رہے ہیں۔ اور اللہ کے اختیارات اور قدرت کا کس قدر اظہار فرما رہے ہیں۔ یہی عجز ہی دراصل اللہ کا ادب کرنے پر ابھارتا ہے۔ وہ جس قدر عظیم ہستی ہے اس کا ادب بھی اسی قدر بجا لانا چاہیے۔

انبیائے کرام علیہم السلام کے ہاں اللہ کے ادب کا اندازہ اس سے لگا سکتے ہیں کہ معمولی معمولی سی لغزش کے باعث وہ روز قیامت اللہ کے ہاں بندوں کی سفارش کرنے سے گریزاں ہوں گے۔ حدیث شفاعت میں وضاحت موجود ہے۔[3]

انبیائے کرام علیہم السلام کے ہاں اللہ کے ادب کی عکاسی اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ وہ اللہ کا حکم بجا لاتے تھے اور اللہ کے سامنے ان کے ہاں ''کیوں'' کا لفظ بھی نہیں تھا۔ کیونکہ ''کیوں'' کا شمار بھی بے ادبی میں ہوتا ہے۔

---

[1] آل عمران 3:8۔ [2] بنيٓ آسرائيل 17:80۔ [3] تفصیل کے لیے دیکھیں: صحيح البخاري، التفسير، سورة بنيٓ إسرآءيل، حديث:4712.

تعلیماتِ نبویہ اور ادبِ الٰہی[1]

1. نام لینے میں ادب

رسول اکرم ﷺ اللہ تبارک و تعالیٰ کا نام لیتے ہوئے ادب کا خیال رکھنے کی تعلیم دیتے تھے۔ اسی لیے اکثر احادیث میں لفظ ''اللہ'' کے ساتھ ''عَزَّ وَجَلَّ'' (زبردست اور جلالت والا) کے الفاظ ملتے ہیں۔ جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

مَنْ قَاتَلَ لِتَكُونَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا فَهُوَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ.

''جس نے اللہ کے کلمے کی سربلندی کے لیے قتال کیا تو وہی اللہ عزوجل کے راستے میں ہے۔''[2]

اسی طرح اللہ کے نام کے ساتھ ''تَبَارَكَ وَتَعَالىٰ'' (بڑا ہی بابرکت اور بڑا ہی بلند) کی صفات کا استعمال بھی فرماتے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے:

يَنْزِلُ رَبُّنَا تَبَارَكَ وَتَعَالىٰ كُلَّ لَيْلَةٍ إِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا حِينَ يَبْقَى ثُلُثُ اللَّيْلِ الآخِرُ....

---

[1] یہاں سے 7 نمبر سب ہیڈنگ تک کا مواد والد گرامی رحمہ اللہ کے مضمون میں میری طرف سے اضافہ ہے۔ (محمد نعمان فاروقی) [2] صحيح البخاري، حديث:123.

’’ہمارا رب تبارک و تعالیٰ ہر رات کے آخری تہائی میں آسمان دنیا پر نزول فرماتا ہے.........‘‘[1]

’’جَلَّ جَلَالُهُ‘‘ کی صفت بھی آپ علیہ السلام اللہ کے نام کے ساتھ استعمال فرماتے تھے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے:

اِتَّقُوا دَعْوَةَ الْمَظْلُومِ . فَإِنَّهَا تُحْمَلُ عَلَى الْغَمَامِ . يَقُولُ اللّٰهُ جَلَّ جَلَالُهُ: وَعِزَّتِي وَجَلَالِي لَأَنْصُرَنَّكَ وَلَوْ بَعْدَ حِينٍ.

’’مظلوم کی آہ سے محفوظ رہو، وہ بادلوں کے اوپر اٹھائی جاتی ہے، اللہ جل جلالہ فرماتا ہے: میری عزت و جلال کی قسم! میں ضرور تیری مدد کروں گا اگرچہ کچھ عرصے بعد ہی......‘‘[2]

ایک اشکال: اللہ تعالیٰ کے لیے ادباً جمع کے صیغوں کا استعمال؟

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ اردو میں اللہ عزوجل کا تذکرہ کرتے ہوئے ادباً جمع کے صیغے استعمال کیے جائیں یا واحد کے؟ اس سوال کو اربابِ تحقیق نے اپنی جولان گاہ بنالیا ہے۔ باقاعدہ کتابیں اور مضامین جانبین سے لکھے جارہے ہیں۔ میں اس بحث میں الجھنا نہیں چاہتا بلکہ یہ عرض کروں گا کہ جب اللہ تعالیٰ کا تذکرہ کیا جارہا ہے، مثلاً آپ کہتے ہیں: ’’اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔‘‘ یا ’’اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔‘‘ ان دونوں جملوں میں اس لحاظ سے کوئی فرق نہیں کہ دوسرے جملے میں زیادہ خداؤں کا تصور ابھرتا ہو کیونکہ پہلے اللہ تعالیٰ کا ذکر کردیا گیا ہے۔ جیسے ہم کہتے ہیں ’’ابو کہہ رہے ہیں۔‘‘ تو

---

[1] صحيح البخاري، التهجد، باب الدعاء والصلاة...، حديث:1145. [2] السلسلة الصحيحة:444/2، حدیث:870۔ اسی طرح ’’تعالىٰ ذكرهُ‘‘ کے الفاظ نبوی بھی ثابت ہیں جس کے معنی ہیں ’’بلند ہو ذکر اس کا‘‘ (سنن أبي داود، حديث:17.)

کوئی بھی اردو دان یہ نہیں سمجھ سکے گا کہ اس سے مراد ہے کہ ایک سے زیادہ ابو کہہ رہے ہیں، لہٰذا دونوں میں سے کوئی بھی صورت اپنانے میں حرج معلوم نہیں ہوتا۔ میں اپنی تحریر کی حد تک دونوں اسالیب اختیار کر لیتا ہوں۔ جمع کے صیغے اختیار کرنے والے کو مشرک کہنا اور واحد کے صیغے استعمال کرنے والے کو بے ادب کہنا افراط وتفریط ہی کی ایک صورت ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے جمع کے صیغے استعمال فرمائے ہیں۔

2 نام رکھنے اور القابات سے نوازنے میں ادب الٰہی

نام رکھنے میں یا القابات سے نوازنے میں اللہ تعالیٰ کی کسی ایسی صفت کو دوسروں میں ثابت نہیں کرنا چاہیے جو اسی کے ساتھ خاص ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کی صفت ''الملک'' (بادشاہ) ہے۔ بادشاہ تو لوگوں میں سے ہوتے ہیں، اس وجہ سے بادشاہ کو بادشاہ کہا جا سکتا ہے مگر کسی کو ''ملک الملوک'' یا ''ملک الاملاک'' یعنی بادشاہوں کا بادشاہ یا جیسے ہم کسی کو کہتے ہیں ''شہنشاہ'' تو اس کی سخت ممانعت ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کے ہاں روز قیامت ذلیل ترین نام ملک الاملاک ہوگا۔''[1]

ہمارے ہاں اللہ کا نام لینے اور لکھنے میں بالکل احتیاط نہیں برتی جاتی۔ آج کل کئی گاڑیوں پر لفظ ''اللہ'' کو اس انداز سے لکھا جاتا ہے اس کے الف میں لفظ محمد لکھا ہوتا ہے، اس کے پہلے لام میں سیدنا ''علی'' رضی اللہ عنہ، دوسرے لام میں سیدہ ''فاطمہ'' رضی اللہ عنہا اور سیدنا ''حسن'' رضی اللہ عنہ اور ''ہ'' میں سیدنا ''حسین'' رضی اللہ عنہ لکھا جاتا ہے۔ اور پنجتن کا عقیدہ رکھنے والوں کے علاوہ بھی بہت سے لوگ دیکھا دیکھی اسے ترویج دے رہے ہیں۔ ......

...... یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی بے ادبی ہے۔ اس کے بارے میں کوئی قانونی تحریک

[1] صحيح البخاري، حديث:2605.

چلائی جانی چاہیے تا کہ اس پر بین لگے۔ یہ جہاں اللہ تعالیٰ کی توہین ہے وہاں ان ہستیوں کی تعلیمات کے بھی عین منافی ہے۔

[3] اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے کھڑے ہونے کا ادب

نماز اللہ تعالیٰ کے حضور حاضری کا ایک موقع ہے۔ آپ ﷺ نے دانت، بدن، کپڑوں، نیت اور جگہ کی طہارت سے لے کر وضو تک اور خشوع وخضوع کی کیفیات سے لے کر نماز کی ظاہری صورت تک بہت سے ادب امت کو سکھلائے ہیں، مثلاً کسی اور سے گفتگو نہیں کرنی، سر جھکا کر کھڑا ہونا ہے، کپڑوں کو سمیٹنا اور داڑھی اور بالوں وغیرہ سے کھیلنا نہیں ہے، اطمینان اور سکون اختیار کرنا ہے اور توجہ مرکوز رکھنی ہے۔ نماز کے لیے چل کر آنے کے لیے وقار اور سکینت کا حکم دیا ہے۔ یہ سب بارگاہ الٰہی کا ادب ہی تو ہے۔

[4] ایمان وعقائد میں ادب الٰہی

سیدنا عدی بن حاتم طائی رضی اللہ عنہ بتاتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی موجودگی میں کوئی شخص تقریر کر رہا تھا۔ اپنی گفتگو میں اس نے کہہ دیا:

مَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ رَشَدَ وَمَنْ يَعْصِهِمَا فَقَدْ غَوٰى.

”جس نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی تو حقیقت میں اس نے ہدایت پالی اور جس نے ان دونوں کی نافرمانی کی تو یقیناً وہ بھٹک گیا۔“

ابھی اس نے یہ کہا ہی تھا کہ آپ ﷺ نے فوراً فرمایا:

بِئْسَ الْخَطِيبُ أَنْتَ! قُلْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ.

''تم اچھے خطیب نہیں ہو!''

مَنْ يَّعْصِهِمَا.

کی بجائے

مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ.

''جس نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کی''

تمھیں کہنا چاہیے تھا۔''[1]

نبی ﷺ نے اللہ تعالیٰ اور اپنے نام کو ایک تثنیہ کی ضمیر میں ایک ساتھ ذکر کرنے کو سخت ناپسند فرمایا۔ کیا وہ لوگ اس سے کچھ سبق لیں گے جو اللہ کی صفات نبی ﷺ میں مانتے ہی نہیں بلکہ نہ ماننے والوں کو گستاخ رسول کا طعنہ بھی دیتے ہیں۔

5 اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے تذکرے میں ترتیب

نبی کریم ﷺ نے جہاں بھی اللہ کے ساتھ اپنا تذکرہ کیا تو ترتیب میں لفظ جلالہ کا ذکر پہلے فرمایا اور اپنا ذکر بعد میں کیا۔ مثلاً فرمایا:

فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ إِلَى اللّٰهِ وَرَسُولِهٖ فَهِجْرَتُهٗ إِلَى اللّٰهِ وَرَسُولِهٖ....

''تو جس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہوگی تو اسی کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لیے سمجھی جائے گی۔''[2]

[1] صحيح مسلم، الجمعة، باب تخفيف الصلاة والخطبة، حديث: 870. [2] صحيح البخاري، الإيمان، باب ما جاء أنّ الأعمال بالنية...، حديث: 54.

دیکھا جائے تو ہجرت رسول اللہ ﷺ کی طرف تھی۔ اللہ کی طرف ہجرت تو ممکن ہی نہیں لیکن چونکہ رسول اللہ ﷺ کی طرف ہجرت اللہ کی خوشنودی اور رضا کے لیے ہوتی ہے، اس لیے آپ ﷺ نے پہلے اللہ تبارک وتعالیٰ کا ذکر کیا۔ اور ہمیں تعلیم دی کہ ہم اللہ کا ذکر پہلے کریں۔ کیونکہ: ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ أَكْبَرُ﴾ ''اور اللہ کا ذکر سب سے بہت بڑا ہے۔''[1]

نبی کریم ﷺ نے نعت گوئی کروائی اور اسے پسند فرمایا اور اس کا اہتمام فرمایا مگر اس کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ اللہ کے ذکر کو ہمیشہ کے لیے پس پشت ڈال دیا جائے، رمضان کی عام راتیں ہوں یا لیلۃ القدر کی خاص رات، خوشیوں کے دن ہوں یا عید کے تہوار، جمعہ کا مبارک دن ہو یا عام ایام، تہجد کا وقت ہو یا اذان اور تکبیر کے درمیان کا مرحلہ ان میں نعت ہی کا اہتمام کرنا اور حمد باری تعالیٰ نہ کرنا تعلیمات نبویہ سے میل نہیں کھاتا۔

6 اللہ کے ذکر کا ادب

مدینہ منورہ کے قریب ہی ''بئر جمل'' نامی جگہ کی طرف سے آپ ﷺ تشریف لا رہے تھے، آپ علیہ السلام کو ایک آدمی ملا اس نے سلام کیا مگر رسول اللہ ﷺ نے اسے سلام کا جواب نہ دیا۔ پھر آپ ایک دیوار تک آئے اور اپنے چہرے اور ہاتھوں کا مسح، یعنی تیمم کیا۔ اس کے بعد اس کے سلام کا جواب دیا۔[2]

آپ علیہ السلام نے اس کے سلام کا جواب کیوں نہ دیا؟ اس سوال کا جواب سنن ابی داوٗد کی حدیث میں ہے:

إِنِّي كَرِهْتُ أَنْ أَذْكُرَ اللّٰهَ تَعَالَىٰ ذِكْرُهُ إِلَّا عَلَىٰ طَهَارَةٍ.

[1] العنکبوت 45:29. [2] صحیح مسلم، الحیض، باب التیمم، حدیث: 369.

''بے شک میں نامناسب سمجھتا ہوں کہ طہارت کے بغیر اللہ تعالیٰ کا ذکر کروں۔ اللہ کا ذکر بلند ہو۔''[1]

7 اللہ کا نام لکھنے میں ادب نبوی

نبی کریم ﷺ نے شاہِ روم ہرقل کو مکتوب گرامی بھیجنا تھا، آپ نے اس کا اظہار کیا توصحابہ رضی اللہ عنہم کہنے لگے: جب آپ کے خط پر مہر نہیں لگی ہوگی تو وہ تو نہیں پڑھیں گے'' تو آپ ﷺ نے چاندی کی ایک انگوٹھی نما مہر بنوائی۔[2]

صحیح بخاری ہی میں یہ وضاحت ہے کہ اس کی ایک سطر میں لفظ''محمد''(ﷺ) ایک سطر میں''رسول'' اور ایک سطر میں لفظ''اللہ'' لکھا ہوا تھا۔[3]

یہ تین سطریں پڑھنے کی ترتیب سے اگرچہ لفظ محمد (ﷺ) سے شروع ہوتی تھیں مگر آپ ﷺ نے اوپر والی سطر میں لفظ''اللہ'' لکھوایا، درمیانی سطر میں''رسول'' اور آخری سطر میں''محمد'' ﷺ۔ یہ ہے نبی ﷺ کی طرف سے اللہ تعالیٰ کا ادب۔ اس مہر کا عکس اس شکل کا ہے جیسا کہ ہم مختلف مقامات پر لگا دیکھتے ہیں۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ ممکن ہے کاتب نے ایسے لکھ دیا ہو مگر اس اشکال کو حدیث کے یہ الفاظ باقی نہیں رہنے دیتے جن میں ہے:''اور میں نے اس میں''محمد رسول اللہ''نقش کرایا ہے۔''[4]

[1] سنن أبي داود، الطهارة، باب في الرجل يرد السلام، حديث:17. [2] صحيح البخاري، حديث: 5875. [3] صحيح البخاري، حديث: 5878. [4] صحيح البخاري، حديث:5877.

ادبِ الٰہی کے زینے

اس بات میں شک وشبہ کی ضرورت ہے نہ گنجائش کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کا بے حد ادب و احترام کرنا چاہیے۔ اتنا ادب واحترام جو ہمارے خیال وگمان سے بھی ماورا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس ذات والا صفات سے ہمارے تعلق کی بنیادیں پائیدار اور گہری ہیں۔ جو بدلی جا سکتی ہیں نہ جگہ سے ہلائی جا سکتی ہیں۔ کوئی اس مضبوط تعلق کا لاکھ انکار کرے، نہیں کر سکتا۔ وہی ایک اللہ ہمارا خالق و مالک، باری ومصوّر، رازق ومحسن، قوی وقادر، حیّ وقیوم، غوث و دستگیر، مشکل کشا و حاجت روا، حافظ و ناصر، رحمٰن ورحیم، صمد وصبور، عزیز وعظیم، رؤف ورحیم، کریم وکفیل، نصیر ووکیل، وھّاب وودود، عالم الغیب والشّھادہ، اور توّاب وغفار ہے۔ اور اللہ کے ہر وصف کا ہمارے ساتھ گہرا اور اٹوٹ تعلق ہے۔ اس عزّوجلّ کے جس قدر اسماء و صفات ہیں، سب ہی اعلیٰ سے اعلیٰ ہیں۔ نہ اس کے کوئی مقابل ہے نہ مماثل۔ وہ ہر عیب اور ضعف سے مبرّا اور ہر خوبی وکمال سے آراستہ ہے۔ اس کے کسی وصف میں نقص یا زوال نہیں آتا۔ اس کی جملہ صفاتِ کمال ازل سے ہیں اور ابد تک رہیں گی۔ ان بنیادی باتوں کے بعد اب یہ سمجھیے کہ ادبِ الٰہی کے لیے کن باتوں کا ہونا ضروری ہے، ملاحظہ کیجیے:

[1] معرفتِ الٰہی

سب سے اوّل اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت ہونی چاہیے۔ آدمی کو جب تک کسی کی صحیح پہچان (معرفت) نہ ہوگی وہ اس کا صحیح ادب بجا نہیں لا سکے گا۔

ہرم بن حیان رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((اَلْمُؤْمِنُ إِذَا عَرَفَ رَبَّهُ عَزَّوَجَلَّ أَحَبَّهُ وَإِذَا أَحَبَّهُ أَقْبَلَ إِلَيْهِ)).

''مومن جب اللہ عز اسمہ کو پہچانے گا تو اس سے محبت کرے گا اور جب اس سے محبت کرے گا تو پھر اسی کی طرف متوجہ رہے گا۔''[1]

امام ابن جوزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((مَنْ ذَاقَ طَعْمَ الْمَعْرِفَةِ وَجَدَ طَعْمَ الْمَحَبَّةِ. فَالرِّضَاءُ مِنْ جُمْلَةِ ثَمَرَاتِ الْمَعْرِفَةِ)).

''جس نے معرفت کا ذائقہ چکھ لیا اس نے محبت کی لذت پالی۔ اور اللہ کے کاموں پر رضا معرفت ہی کے نتیجے میں ہے۔''[2]

امام ابن قیّم علیہ الرحمہ کا ارشاد ہے:

((إِذَا لَمْ يَكُنْ فِيهِ مَعْرِفَةُ اللّٰهِ وَمَحَبَّتُهُ. فَحَظُّهُ الظُّلْمَةُ وَالضَّيْقُ)).

''جب دل میں اللہ تعالیٰ کی معرفت اور محبت نہ ہوتو پھر دل تاریکی وتنگی سے دو چار رہتا ہے۔''[3]

حضرت علی بن عثمان ہجویری علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: اما ہر کہ بخداوند تعالیٰ راہ داند ازخلق حاجت نخواہد، کہ حاجت بخلق دلیل بے معرفتے بود......

اِسْتِعَانَةُ الْمَخْلُوقِ مِنَ الْمَخْلُوقِ كَاسْتِعَانَةِ الْمَسْجُونِ مِنَ الْمَسْجُونِ.

---

[1] موسوعۃ نضرۃ النعیم:3454/8۔ [2] صید الخاطر :30/1۔ [3] الفوائد:33.

''جسے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو، اسے مخلوق کی حاجت نہیں رہتی۔ مخلوق کا مخلوق سے مدد لینا ایسے ہی ہے، جس طرح قیدی کا قیدی سے مدد لینا ہوتا ہے۔''[1]

کیونکہ دونوں ہی مجبور و بے بس ہیں۔

ابن یعقوب فیروز آبادی علیہ الرحمہ کا ارشاد ملاحظہ فرمائیے:

((مَنْ عَرَفَ اللّٰهَ تَعَالٰى صَفَا لَهُ الْعَيْشُ. وطَابَتْ لَهُ الْحَيٰوةُ وَهَابَهُ كُلُّ شَيْءٍ. وَذَهَبَ عَنْهُ خَوْفُ الْمَخْلُوقِينَ وَأَنِسَ بِاللّٰهِ)).

''جس شخص نے اللہ تعالیٰ کو پہچان لیا اس کی زندگی پاکیزہ ہوگئی، اور عیش و نشاط سے ہمکنار ہوگئی۔ اور مخلوق کا خوف اس کے دل سے نکل گیا۔ اور وہ اپنے رب سے مانوس ہوگیا۔''[2]

یحییٰ بن معاذ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

يَخْرُجُ الْعَارِفُ مِنَ الدُّنْيَا وَلَمْ يَقْضِ وَطَرَهُ مِنْ شَيْئَيْنِ: بُكَاؤُهُ عَلٰى نَفْسِهِ. وَثَنَاؤُهُ عَلٰى رَبِّهِ.

''حق تعالیٰ کی معرفت رکھنے والا شخص جب دنیا سے جاتا ہے تو دو چیزوں کے متعلق اس کی خواہش پوری نہیں ہوتی: ایک اپنے رب کے تصور سے رونا اور دوسری اپنے رب کی جی بھر کر تعریف کرنا۔''[3]

دیکھا آپ نے! کس قدر فوائد ہیں اللہ تعالیٰ کی معرفت کے۔ اور کس قدر ضروری ہے معرفت الٰہی؟ جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے ادب کا پاس نہیں کیا دراصل وہ اللہ تعالیٰ

[1] كشف المحجوب، ص:98. [2] بصائر ذوي التمييز بصيرة في عرف:52/4. [3] بصائر ذوي التمييز بصيرة في عرف:54/4.

کی معرفت سے محروم ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کی جائے۔ اور یاد رکھیے وہ حاصل ہوتی ہے قرآن اور حدیث سے۔ لیکن یہ کس قدر دکھ کی بات ہے کہ ہم قرآن اور حدیث کی طرف نہیں آتے۔ حد سے حد قرآن مجید کی تلاوت و تجوید اور حدیث کا دورہ یہی ہمارا منتہائے نگاہ رہ گیا ہے۔ اس سے آگے ہم بڑھنے کے لیے تیار ہی نہیں اِلَّا مَاشَاءَ اللّٰہ۔ ہمارے سامنے بہت سے غیر مسلموں کے بے شمار ایسے واقعات ہیں جو محض خالق و مالک کی صناعی اور بُوقلموں رنگینی دیکھ کر مسجودِ خلائق کے سامنے سجدہ ریز ہوئے اور کلمۂ شہادت پکار اٹھے۔

ایک شخص نے باغ میں کِھلا ہوا پھول دیکھا تو اسلام لے آیا۔ ایک بہت بڑے انگریز افسر نے آیت:

﴿وَالْجِبَالَ اَوْتَادًا﴾

''اور کیا (ہم نے) پہاڑوں کو میخیں (نہیں بنایا؟)'' [1]

پڑھی تو کلمہ شہادت پکار اٹھا۔

ایک شخص نے آیۂ قرآنی:

﴿فِیْ بَحْرٍ لُّجِّیٍّ یَّغْشٰهُ مَوْجٌ﴾

''گہرے سمندر میں ہوں جسے ایک موج ڈھانپ رہی ہو......'' [2]

کی تلاوت کی تو اسلام کے دامن میں آ گیا۔ خود قرآنِ مجید میں رب تعالیٰ کی عظمت و کبریائی پر بکثرت دلائل بیان ہوئے ہیں۔ اللہ کرے ہمارے اہل علم و قلم جرأت و ہمت کر کے عوام کے سامنے یہ خوبصورت مضامین بھی رکھیں۔ مگر انھیں کئی کئی

[1] النبأ 78:7. [2] النور 40:24.

مہینے اپنے فرقہ وارانہ موضوعات اور فتویٰ بازی ہی سے فرصت نہیں ملتی۔ یہ لوگوں کی نبضیں دیکھ کر ان کے ساتھ چلتے ہیں، حالانکہ انھیں لوگوں کو اپنے ساتھ چلانا چاہیے، اور خود قرآن و حدیث کی جلو میں آ جانا چاہیے ؎

حدیث بے خبراں کہ با زمانہ بساز
زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے سورۂ بقرہ کی آیت: ﴿ يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا ﴾ کے تحت چند بصیرت افروز دلائل و استشہادات یکجا فرمائے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ایک دیہاتی سے سوال ہوا کہ اللہ کے وجود کی دلیل کیا ہے؟ اس نے برجستہ جواب دیا:

يَا سُبْحَانَ اللّٰهِ! إِنَّ الْبَعْرَ لَيَدُلُّ عَلَى الْبَعِيرِ وَإِنَّ أَثَرَ الْأَقْدَامِ لَتَدُلُّ عَلَى الْمَسِيرِ فَسَمَاءٌ ذَاتُ أَبْرَاجٍ وَأَرْضٌ ذَاتُ فِجَاجٍ، وَبِحَارٌ ذَاتُ أَمْوَاجٍ؟ أَلَا يَدُلُّ ذٰلِكَ عَلَى وُجُودِ اللَّطِيفِ الْخَبِيرِ؟

''سبحان اللہ!! اونٹ کی مینگنی اونٹ کا پتہ دیتی ہے، قدموں کے نشانات کسی راہ گزر کا بتاتے ہیں تو پھر یہ ستاروں سے بھرا آسمان، راستوں سے بھری زمین اور ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر (کیوں نہیں خالق کا بتاتے؟) کیا یہ سب دلائل لطیف وخبیر کے وجود پر دلالت کناں نہیں ہیں؟''[1]

ایک دفعہ مشہور ادیب و دانشور عبدالمجید قریشی علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ''تبلیغ اسلام'' کے حوالے سے گفتگو شروع ہو گئی۔ علامہ مرحوم نے قریشی صاحب کو ان نومسلمین کے بارے میں کتاب لکھنے کو کہا جو ہندوستان

[1] البقرة 21:2 تفسیر ابن کثیر، تفسیر سورۂ بقرہ، آیت:21.

کے قصبات و دیہات میں حلقۂ اسلام میں داخل ہو رہے تھے۔ آپ نے کہا:

''اگر کوئی شخص ان از خود مسلمان ہونے والوں سے ملے اور ان سے قبول اسلام کی وجوہات دریافت کر کے ایک کتاب میں جمع کر دے تو اس سے تبلیغ اسلام کے مقصد کو بے حد تقویت حاصل ہوگی۔'' علامہ صاحب نے یہ بھی کہا:

''ایسا کرنے سے کئی ایسے عجیب اور جدید دلائل آپ کو ملیں گے کہ دنیا حیران رہ جائے گی۔''[1]

اور علامہ مرحوم کی یہ بات ہے بھی مبنی بر حکمت۔ مشہور مصنف اور محقق ڈاکٹر آر ایل مَیلِّیما یورپ کے علمی حلقوں میں خاص مقام رکھتے ہیں، وہ لکھتے ہیں: ''مجھے اسلام میں کیا حسن نظر آیا ہے؟ وہ کون سی جاذبیت تھی جو مجھے اس عقیدے کی طرف کھینچ لائی؟'' تحریر کرتے ہیں: '' 1 صرف ایک اعلیٰ و برتر ہستی اللہ کا اقرار۔ یہ نظریہ فطرت کے اتنا قریب ہے کہ سمجھ بوجھ رکھنے والا کوئی بھی انسان اسے آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے۔ اللہ بڑا ہی بے نیاز ہے۔ سبھی مخلوقات اس کی محتاج ہیں۔ 2 اللہ کا اپنی کائنات، مخلوقات اور اشرف المخلوقات انسان سے رابطہ براہ راست قسم کا ہے۔

...... یہ دنیا اس کے لیے دارالامتحان ہے۔ 3 مذہب میں کوئی جبر نہیں، صداقت جہاں سے بھی ملے اسے قبول کر لو۔ 4 اسلام رشتۂ اخوت سے منسلک کرتا ہے...... اس کا مظاہرہ حج کے موقع پر احرام باندھ کر کیا جاتا ہے 5 اسلام زندگی میں روح اور مادے دونوں کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے۔ 6 شراب اور نشہ آور اشیاء کو ممنوع قرار دینے کا عمل اپنے اندر بڑی عظمت رکھتا ہے۔''[2]

[1] اسلام زندہ باد، ص: 8-7۔ [2] ہم کیوں مسلمان ہوئے؟ ص: 19-21 .

اگر مذکورہ کتاب کے ساتھ ایک اور کتاب ''اسلام ہی ہمارا انتخاب کیوں؟'' (416 صفحات) جسے حال ہی میں ادارہ دارالسلام لاہور نے چھپوایا ہے، کا مطالعہ کر لیا جائے تو ہمارا مطلوب و مقصود سمجھنے میں کافی آسانی ہو گی۔

ایک مرتبہ علامہ عنایت اللہ مشرقی مرحوم کی کیمبرج یونیورسٹی کے مشہور ماہر فلکیات سر جمیز جینس سے یونیورسٹی کے باہر ملاقات ہوئی جو بارش میں چرچ کی طرف جا رہے تھے۔ علامہ کہتے ہیں: ''میں نے قریب ہو کر سلام کیا۔ انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ دوبارہ سلام کیا تو وہ متوجہ ہوئے۔ اور کہنے لگے: ''تم کیا چاہتے ہو؟'' میں نے کہا: دو باتیں، اول یہ کہ زور سے بارش ہو رہی ہے اور آپ نے چھاتا بغل میں داب رکھا ہے۔ سر جمیز مسکرائے اور چھاتا تان لیا۔ دوم یہ کہ آپ جیسا شہرۂ آفاق آدمی گرجا میں عبادت کے لیے جا رہا ہے، یہ کیا؟ میرے اس سوال پر پروفیسر لمحہ بھر کے لیے رک گئے۔ پھر کہا: ''آج شام کو چائے میرے ساتھ پیو۔'' علامہ بروقت پہنچ گئے۔ چائے میز پر لگی ہوئی تھی۔ پروفیسر صاحب نے اَجرام آسمانی کی تخلیق، ان کے حیرت انگیز نظام، بے انتہا پہنائیوں اور فاصلوں، ان کی پیچیدہ راہوں اور مداروں، نیز باہمی کشش اور طوفان ہائے نوح پر وہ ایمان افروز تفصیلات پیش کیں کہ میرا دل اللہ کی داستانِ کبریائی و جبروت پر دہلنے لگا۔ ان کے بال کھڑے، آنکھوں سے حیرت و خشیت کی دوگونہ کیفیتیں عیاں تھیں۔ اللہ کی حکمت و دانش کی ہیبت سے ان کے ہاتھ قدرے کانپ رہے تھے اور آواز لرز رہی تھی۔ فرمانے لگے: ''عنایت اللہ خاں! جب میں خدا کے تخلیقی کارناموں پر نظر ڈالتا ہوں تو میری تمام ہستی اللہ کے جلال سے لرزنے لگتی ہے۔ اور جب کلیسا میں خدا کے سامنے سرنگوں ہو کر کہتا ہوں ''تو بہت بڑا ہے'' تو

میری ہستی کا ہر ذرّہ میرا ہمنوا بن جاتا ہے۔ مجھے بے حد سکون اور خوشی نصیب ہوتی ہے۔ مجھے دوسروں کی نسبت عبادت میں ہزار گنا کیف ملتا ہے۔ کہو، عنایت اللہ خان! تمھاری سمجھ میں آیا کہ میں گرجے کیوں جاتا ہوں؟ علامہ مشرقی نے کہا: جناب والا! آپ کی روح افزا تفصیلات سے میں بے حد متأثر ہوا ہوں۔ قرآنِ مجید کی دو آیات یاد آ گئی ہیں۔ اگر اجازت ہو تو پیش کروں۔ وہ کہنے لگے: ''ضرور'' چنانچہ میں نے سورۂ فاطر کی آیت نمبر 28,27 پڑھ کر سنائیں:

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ ○ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ؕ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ﴾

اور ان کا ترجمہ بھی پیش کیا۔[1] ترجمہ سنتے ہی پروفیسر جمیز بولے: ''کیا کہا؟ اللہ سے صرف اہل علم ڈرتے ہیں؟ حیرت انگیز، بہت عجیب۔ یہ بات جو مجھے پچاس برس کے مسلسل مطالعہ و مشاہدہ سے معلوم ہوئی۔ محمد (ﷺ) کو کس نے بتائی؟ کیا قرآن میں واقعی یہ آیت موجود ہے؟ اگر ہے تو میری شہادت لکھ لو کہ قرآن ایک

[1] ان آیات کا ترجمہ یہ ہے: ''کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ اللہ نے آسمان سے پانی اتارا، پھر ہم نے اس کے ذریعے کئی پھل نکالے جن کے رنگ مختلف ہیں۔ اور پہاڑوں میں کچھ قطعے سفید اور کچھ سرخ ہیں، جن کے رنگ مختلف ہیں اور کچھ (پہاڑ) کالے سیاہ ہیں اور انسانوں، جانوروں اور چوپاؤں سے بھی کچھ ایسے ہیں جن کے رنگ اسی طرح مختلف ہیں۔ اللہ سے تو اس کے بندوں میں سے صرف جاننے والے ہی ڈرتے ہیں۔ بے شک اللہ سب پر غالب، بے حد بخشنے والا ہے۔''

الہامی کتاب ہے۔ محمد (ﷺ) اَن پڑھ تھے (ﷺ) انھیں یہ عظیم حقیقت خود بخود معلوم نہیں ہوسکتی، انھیں یقیناً اللہ نے بتائی تھی۔ بہت خوب، بہت عجیب۔''

اللہ کے وجود پر ایمان

قارئین! معرفت کے لیے سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کے وجود کو ماننا ضروری ہے۔ اہل علم نے اس کے مختلف دلائل بیان فرمائے ہیں جو تفصیل طلب ہیں۔ ہر ذی علم کا انداز تفہیم اپنا اپنا ہے۔ کسی نے اپنے پاس آنے والے دہریوں کے سامنے کشتی کی مثال پیش کی کیونکہ وہ لوگ کشتی کے ذریعے پار آئے تھے، عالم نے کہا: درخت خود بخود کٹ گیا، پھر اس کے تختے بن گئے، وہ خود ہی کشتی کی صورت میں باہم پیوست ہو گئے اور کشتی تیار ہوگئی اور دریا میں اپنے آپ چلنا شروع ہو گئی۔ دہریوں نے کہا: ''آپ عقلمند ہو کر کیسی باتیں کرتے ہیں؟ کیا صانع (بنانے والے) کے بغیر کوئی مصنوع (بنائی گئی چیز) خود بخود بن سکتی اور رواں دواں ہوسکتی ہے؟'' عالم نے جواب دیا: حیرت تو تم پر ہے۔ جب ایک کشتی بغیر صانع (بنانے والے کے) اپنے آپ نہیں بن سکتی۔ اور بغیر چلانے والے کے خود بخود چل نہیں سکتی تو بھلا اتنی بڑی کائنات اپنے آپ وجود میں کیسے آ گئی؟ اور یہ کروڑوں اربوں سیارے کیسے چل سکتے ہیں؟ وہ لاجواب ہو گئے اور اپنے سر جھکا لیے۔ کہتے ہیں یہ عالم، امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ تھے۔ اور آنے والے لوگ دہریے (اللہ کے منکر) تھے۔

اسی طرح ایک اور عالم نے کہا: ایک بالکل بند کمرہ ہے، باہر سے چاندی کی طرح سفید ہے اور اندر سے سونے کی طرح زرد ہے۔ نہ کوئی روزن ہے نہ کھڑکی یا دروازہ۔ یکدم وہ کمرہ پھٹتا ہے اور اس سے ننھا منا چوزہ برآمد ہوتا ہے۔ چوزہ اندر

زندہ تھا۔ اور کوئی اسے وہاں سب کچھ غذا اور ہوا پہنچا رہا تھا۔ اسی کو قرآن مجید نے کہا:

﴿يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ﴾

''وہ (اللہ) زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے۔''[1]

یعنی انڈہ مردہ اور برآمد ہونے والا بچہ جاندار۔ یہ پیدا کرنے والا اللہ ہے۔

ایک اور عالم نے فرمایا کہ شہد کی مکھیاں رنگا رنگ گلہائے شگفتہ کا رس (نیکٹر) چوستی ہیں، وہ ان کے اندر جا کر شیریں، پُر ذائقہ بن کر صحت بخش شہد کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔ اور منوں کے حساب سے چھتوں میں ہفتوں تک محفوظ رہتا ہے۔ نہ اس میں کوئی سڑاند پیدا ہوتی ہے نہ بدبُو۔ قرآنِ مجید نے خصوصیت سے اس کا تذکرہ فرمایا ہے:

﴿وَ اَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا يَعْرِشُوْنَ ۝ ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا يَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ﴾

''اور آپ کے رب نے شہد کی مکھی کو الہام کیا کہ تو پہاڑوں میں گھر (چھتے) بنا اور درختوں میں اور ان کے (چھپروں) میں جن میں لوگ بیلیں چڑھاتے ہیں۔ پھر ہر قسم کے پھلوں (اور پھولوں) سے رس چوس، پھر اپنے رب کی ہموار راہوں پر چل۔ ان کے پیٹوں سے مختلف رنگوں کا مشروب (شہد) نکلتا ہے، اس میں لوگوں کے لیے شفا ہے۔ بے شک اس میں بھی غور وفکر کرنے والوں کے لیے بہت بڑی نشانی ہے۔''[2]

[1] یونس 10:31. [2] النحل 16:68,69.

ایک اور ذی علم نے کہا: درخت کے پتے جب ایک خاص کیڑا کھاتا ہے تو وہ ریشم بن کر نکلتا ہے۔ بکری کھاتی ہے تو دودھ کی شکل میں برآمد ہوتا ہے۔ بیشک بڑوں کی بڑی ہی باتیں ہوتی ہیں۔ ان دلائل سے جہاں اللہ تعالیٰ کی قدرت و ندرت اور حیرت انگیز کاریگری ظاہر ہو رہی ہے، وہاں ہمارا مدّعا بھی ثابت ہو رہا ہے کہ اس کا وجود برحق ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ کے وجود اطہر کی کیفیت اور صورت بیان نہیں کر سکتے۔ وہ جیسا بھی ہے بے مثال ہے۔ اس کی تجسیم اور شکل وصورت کسی کو معلوم ہی نہیں جو بیان کی جائے۔ اہلسنت والجماعت کا یہی عقیدہ ومسلک ہے۔ عقل اور فراست اللہ کی دَین اور خصوصی عطیہ ہے، وہ جسے چاہے اس نور سے نواز دے۔ اسی طرح ایک جنگلی دیہاتی نے جو بات کی وہ اپنی جگہ فصاحت و بلاغت کا دریائے تلاطم خیز ہے۔ دیہاتی نے اونٹ کی مینگنیاں دیکھیں اور زمین پر آدمی کے قدموں کے نشان دیکھے، اور پکارا ٹھا:

يَا سُبْحَانَ اللّٰهِ! إِنَّ الْبَعْرَ لَيَدُلُّ عَلَى الْبَعِيرِ وَإِنَّ أَثَرَ الْأَقْدَامِ لَتَدُلُّ عَلَى الْمَسِيرِ. فَسَمَآءٌ ذَاتُ أَبْرَاجٍ وَأَرْضٌ ذَاتُ فِجَاجٍ. وَ بِحَارٌ ذَاتُ أَمْوَاجٍ أَلَا يَدُلُّ ذَالِكَ عَلٰى وُجُودِ اللَّطِيفِ الْخَبِيرِ؟

”اس میں شک نہیں کہ مینگنی سے اونٹ کا، قدموں کے نشانات سے چلنے والے آدمی کا پتہ لگ سکتا ہے، تو کیا ان ستاروں اور سیاروں سے مزین آسمان، کشادہ راستوں اور سڑکوں سے آراستہ زمین، اور ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندروں سے لطیف وخبیر ربّ کے وجود کا پتہ نہیں چل سکتا؟“ [1]

اس دیہاتی بدوی نے کس استفہامیہ اور منطقیانہ انداز سے وجود باری تعالیٰ کی کتنی

[1] تفسیر ابن کثیر :214/1.

زبردست دلیل پیش کی۔ سبحان اللہ، ماشاء اللہ، آج کل بھی اہل دیہات میں عقلاء ملتے ہیں۔ اللہ کرے سب افراد عقل سے کام لیں تا کہ اللہ تعالیٰ کی صحیح عظمت و شان کا پورا خاکہ کھینچ سکے اور لوگ اللہ تعالیٰ کی صحیح عظمت و رفعت کا ادراک کر سکیں۔

کئی لوگ جدید دلائل سننے کے عادی ہوتے ہیں وہ بھی سن لیں۔ جاپان کی موٹر کمپنی Toyota نے یکم جولائی 2009ء کو لوگوں کے سامنے -Thought Controlled wheel chair (تھاٹ کنٹرولڈ وہیل چیئر) ٹیکنالوجی کا مظاہرہ کیا۔ وہیل چیئر پر بیٹھا ہوا آدمی اپنے ہاتھ کو استعمال کیے بغیر محض اپنے دماغ کے ذریعے وہیل چیئر کو اپنی مرضی کے مطابق جس طرح چاہے چلا سکتا ہے۔ اگر انسان میں یہ صلاحیت ہے تو کیا خالق کائنات سے ایسا ممکن نہیں کہ وہ اپنی مشیت سے پوری کائنات کا کنٹرول سنبھالے ہوئے ہے!!

قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ کا تعارف

ہم قرآنِ کریم سے اللہ تعالیٰ کا تعارف پیش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا اسم ذاتی صرف ایک ہے اور وہ ہے ''اللہ''۔ البتہ اس ذات والا صفات کے اسمائے صفات کثیر ہیں اور وہ 99 سے زیادہ ہیں۔ نام مبارک ''اللہ'' قرآنِ مجید میں دو ہزار ایک سو اکاون (2151) بار استعمال ہوا ہے۔ یہ اسم عَلَم ہے اور رب تعالیٰ کے لیے خاص ہے۔ علمائے تحقیق کے مطابق اسم ''اللہ'' کسی سے مشتق نہیں۔

اگر لفظ اللہ کا ہمزہ (الف) نہ لکھا جائے تو لِلّٰہ پڑھا جاتا ہے۔ جس کا معنی بنتا ہے کہ ہر ایک شئے اللہ ہی کے لیے ہے۔ پہلا لام کم ہو جائے تو رہ جاتا ہے لَہٗ تو معنی ہے ''اسی کے لیے''۔ اگر لَہٗ کا لام کم ہو جائے تو بن جاتا ہے ''ہٗ''۔ تو اس کا معنی ہو

گا ''وہی''۔ یعنی کائنات کا خالق، مالک، مختار، داتا، غوث، حاجت روا، مشکل کشا کون؟ جواب ایک ہی ہے ''وہی'' مطلب یہ کہ اور کوئی نہیں۔

یہ اسمِ مبارک اللہ کی ندرت ہے کہ ایک ایک حرف کم کرتے جائیں معنی و مفہوم وہی ذات مُسْتَجْمِعِ لِجَمِيعِ صِفَاتِ الْكَمَالِ (وہ ذات اقدس جو کمال کی جملہ صفات کو جمع کرنے والی ہے) ورنہ اور کسی نام میں یہ بات نہیں۔ قرآن مجید میں ان چاروں الفاظ وحروف: اَللّٰه. لِلّٰه. لَهٗ. هٗ کا استعمال ہوا ہے۔ مثلاً:

1 ﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾

''بے شک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔''[1]

2 ﴿قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ﴾

''آپ (ﷺ) کہہ دیجیے کہ کام سب کا سب اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔''[2]

3 ﴿لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾

''جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے سب اسی کی ملکیت ہے۔''[3]

4 ﴿وَاَنْ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّقُوْهُ﴾

''نماز کی پابندی کرو۔ اور اسی ایک ذات سے ڈرو۔''[4]

اور فرمایا:

﴿اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ﴾

---

(1) البقرۃ2:199۔ (2) آل عمران3:154۔ (3) النسآء4:171۔ (4) الأنعام6:72.

''بس اس طریقے کی پیروی کیجئے جو آپ کے رب کی طرف سے آپ پر وحی کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ اور مشرکین کی طرف خیال نہ کیجیے۔ (ان کی پروا نہ کیجیے۔)''[1]

قارئین! آپ نے ملاحظہ کیں اسم مبارک اللہ کی بوقلموں اعجاز آفرینیاں؟ سبحان اللہ! کتنی اعلیٰ اور غور طلب ہیں۔

اب ذرا کلمہ طیّبہ لَا اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہ کے حروف پر تدبُّر کریں۔ سارے کلمہ میں وہی حروف ہیں جو اسم ذات ''اللہ'' کے اندر موجود ہیں۔ پورے کلمۂ طیّبہ میں کوئی زائد حرف نہیں۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ لیں۔ نام اقدس ''اللہ'' جب کھولا تو ''لا الٰہ الاّ اللّٰہ'' کا جملۂ طیّب و اطہر بن گیا۔ اور جب اسے سمیٹا تو اللہ رہ گیا۔ ہے کہیں گنجائش شرک کی؟ غور کیجیے توحیدِ خالص کا کس قدر اہتمام فرمایا۔ اور غیریت کا شائبہ تک نہ آنے دیا۔ انبیاء و مرسلین علیہم السلام بدلتے رہے مگر شروع سے لے کر خاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ کلمہ وہی رہا۔ اس میں ایک حرف اور زیر زبر کی بھی تبدیلی واقع نہ ہوئی۔ ہر رسول کی رسالت کا الگ کلمہ رکھا مگر اس کلمہ توحید ''لا الٰہ الاّ اللّٰہ'' کے اندر کسی رسول کو بھی شریک و دخیل نہیں کیا۔ یعنی کلمۂ لاالٰہ......کو خالص رکھا بالکل خالص۔

اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنا کوئی مشکل نہیں، بالکل آسان ہے۔ یہ انفس، یہ آفاق، یہ سب رنگ کائنات، یہ پھیلی ہوئی زمین، فلک بوس پہاڑ، بہتی ہوئی ندیاں، ابلتے ہوئے فوّارے، گرتی ہوئی آبشاریں، سرسبز و شاداب باغات، چٹکتی ہوئی کلیاں، مسکراتے ہوئے پھول، چہکتے ہوئے عنادِل، مہکتے ہوئے گلہائے تر، بہتے ہوئے دریا، ٹھاٹھیں مارتے سمندر، اپنے اپنے مدار میں گھومنے والے کروڑوں اربوں ستارے اور

[1] الأنعام6:106.

سیّارے، سب اللہ تعالیٰ کی معرفت کے دلائل ہی تو ہیں۔ خود انسان کے اپنے اندر بیکراں کائنات ہے، جس کے ایک ایک عضو کے لیے جدا جدا اسپیشلسٹ ہیں، الگ الگ کتابیں ہیں جس کی تفصیلات ہیں۔ حیرت انگیز انسانی جسم کے بارے میں قرآنِ مجید نے ﴿وَفِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ﴾ کہہ کر بڑا گہرا اور زبردست اشارہ کر دیا۔

اب اللہ کی معرفت حاصل کرنے کے لیے قرآنِ حکیم سے پوچھتے ہیں کہ ہمارا اللہ کون ہے؟ سب سے پہلی اس کی کون سی دلیل ہے؟ قرآنِ مجید کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارا خالق ہے، چنانچہ فرمایا:

1 ﴿إِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلَّٰقُ الْعَلِيمُ﴾

"یقیناً آپ کا رب ہی زبردست پیدا کرنے اور خوب جاننے والا ہے۔"[1]

2 ﴿قُلِ اللَّهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ﴾

"آپ کہہ دیجیے کہ اللہ ہی پہلی بار پیدا کرتا ہے، پھر وہی دوبارہ بھی پیدا کرے گا۔"[2]

3 ﴿خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ﴾

"اس نے انسان کو نطفے سے پیدا کیا، پھر وہ صریح جھگڑالو بن بیٹھا۔"[3]

4 ﴿وَاللَّهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ﴾

"اور اللہ نے تمام چلنے والے جانوروں کو پانی ہی سے پیدا فرمایا۔"[4]

5 ﴿الَّذِيٓ أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ طِينٍ﴾

① الحجر 86:15۔ ② یونس 34:10۔ ③ النحل 4:16۔ ④ النور 45:24۔

''اس نے جو چیز بھی بنائی نہایت خوبصورت بنائی اور انسان کی بناوٹ گیلی مٹی سے شروع کی۔''[1]

6 ﴿خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا﴾

''اس نے تم سب کو ایک ہی جان سے پیدا کیا، پھر اسی سے اس کا جوڑا بنایا۔''[2]

7 ﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ﴾

''اور اللہ کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا، پھر اب تم انسان بن کر پھیل رہے ہو۔''[3]

8 ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾

''اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو۔ وہ جس نے تمھیں اور تم سے پہلوں کو پیدا کیا تا کہ تم پرہیز گار بن جاؤ۔''[4]

فرقانِ حمید کی ان آیات میں بتلایا ہے:

- اللہ تعالیٰ خلّاق ہے۔ خلّاق مبالغہ کا صیغہ ہے، یعنی بہت پیدا کرنے والا۔ انسان اور دیگر مخلوقات جن کی اقسام ہزاروں سے متجاوز ہیں، سب کو پیدا کرنے والا اور بکثرت پیدا کرنے والا۔ کُل مخلوق، پھر اس ساری مخلوق کی اقسام اور تفصیلات اور آج تک ان کی تعداد اور مکمل توضیحات وتشریحات سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کو معلوم نہیں۔
- انسان کو پہلی بار بھی اسی نے پیدا کیا۔ اور مرنے کے بعد دوبارہ بھی وہی پیدا کرے

[1] السجدة32:7۔ [2] الزمر39:6۔ [3] الروم20:30۔ [4] البقرة21:2۔

گا۔ دونوں مرتبہ اللہ ہی پیدا کرے گا۔ اس کے ساتھ اور کوئی نہیں تھا، کوئی نہیں ہے اور کوئی نہیں ہوگا۔ اللہ کے علاوہ کوئی اور انسان کا کوئی بال اور ناخن بھی نہیں بنا سکتا۔

- بتایا، انسان کو پانی سے پیدا فرمایا۔ اس لیے اللہ جل مجدہٗ کے بارے میں باتیں بنانے والے کو اپنی اوقات نہیں بھولنی چاہیے۔
- اللہ تعالیٰ نے چوپاؤں کو بھی پانی سے پیدا فرمایا۔
- اللہ کی ساری پیدائش نہایت خوبصورت ہے۔ اور انسان (آدم علیہ السلام) کو جوہرِ مٹی سے پیدا کیا تا کہ بندہ اپنی اصل نہ بھولے۔ اسے سڑی ہوئی، بد بُودار اور سیاہ رنگ کی مٹّی سے پیدا کر کے سب مخلوقات سے حسین و دلکش بنایا۔
- اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو ایک جان، یعنی آدم علیہ السلام سے، پھر اُن ہی کی بائیں پسلی سے حوا علیہا السلام کو پیدا فرمایا۔ کچھ لوگ حضرت حوا کی اس طرح پیدائش سے پریشان ہیں لیکن وہ خالق و بدیع بھلا کیا کچھ نہیں کر سکتا؟ جو بات قرآن یا صحیح حدیث میں آ جائے اس کا انکار روا نہیں ہے۔
- اوّل انسان (بشر) کو مادۂ خاک سے بنا کر، رنگا رنگ کاموں میں مشغول فرما کر دنیا میں بکھیر دیا۔ اور خاک کے اس پیکر کو جو شرف دیا وہ کسی اور مخلوق کو نہیں دیا۔
- بتایا کہ اے انسانو! اپنے رب کی بندگی کرو جس نے تمھیں اور تم سے پہلوں کو پیدا فرمایا۔ مطلب یہ کہ یہ بات ہرگز نہ بھولو اور قاعدے وکلیے کے طور پر خوب یاد رکھ لو کہ جو خالق ہوتا ہے وہی عبادت کا استحقاق رکھتا ہے۔ اور اللہ کی خالص عبادت کر کے ہی تم اللہ کی پکڑ اور سزا سے اپنا دامن بچا سکتے ہو۔ بصورت دیگر اپنی تخلیق کا مقصدِ حقیقی (خاص اللہ کی عبادت) فراموش کر کے جہنم کی سزا بھگتو گے۔ وہاں کوئی دلیل اور سفارش کام نہ دے گی۔

ہاں، یہ نکتۂ حقیقت افروز بھی ذہن میں رکھو بلکہ بٹھا لو کہ اللہ تعالیٰ ہی ہمارا مصوّر ہے۔ وہ ہمارا خالق بھی ہے اور مصور بھی ہے۔ وہ جس طرح چاہتا ہے ہماری شکل وصورت بناتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

1 ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ﴾

''اور بے شک ہم نے تمھیں پیدا کیا پھر ہم ہی نے تمھاری شکل وصورت بنائی۔''[1]

2 ﴿اَلَّذِیْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۝ فِیْۤ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ﴾

''اس ذات اقدس نے تجھے پیدا کیا۔ ٹھیک ٹھاک اور درست اور برابر بنایا...۔''[2]

3 ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ﴾

''یقیناً ہم نے انسان کو سب سے اچھی صورت میں پیدا کیا۔''[3]

4 ﴿وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَاِلَیْهِ الْمَصِیْرُ﴾

''اور اسی (اللہ) نے تمھاری صورتیں بنائیں اور سب (مخلوقات) سے اچھی صورتیں بنائیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔''[4]

5 ﴿وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ﴾

''اور اسی (اللہ) نے تمھاری صورتیں بنائیں اور بڑی اچھی بنائیں۔ اور تمھیں عمدہ عمدہ چیزیں کھانے کو عطا کیں۔ یہی اللہ تمھارا رب ہے۔ پس اللہ بہت برکتوں والا اور سارے جہانوں کا پروردگار ہے۔''[5]

---

[1] الأعراف 11:7۔ [2] الانفطار 7:82,8۔ [3] التین 95:4۔ [4] التغابن 64:3۔ [5] المؤمن 64:40.

6 ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ ○ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ○ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ﴾

''اور یقیناً ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے پیدا کیا، پھر اسے نطفہ بنا کر محفوظ جگہ میں قرار دے دیا، پھر نطفہ کو ہم نے جما ہوا خون بنا دیا، پھر اس خون کے لوتھڑے کو گوشت کا ٹکڑا کر دیا، پھر گوشت کے ٹکڑے کی ہڈیاں بنا دیں، پھر ہڈیوں کو ہم نے گوشت پہنا دیا، پھر دوسری بناوٹ میں اس کو پیدا کر دیا۔ پس برکت والا ہے وہ اللہ جو سب سے بہترین پیدا کرنے والا ہے۔''[1]

7 ﴿هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾

''وہ ذاتِ بابرکات، ماں کے رحموں میں تمھاری صورتیں جس طرح کی چاہتا ہے، بناتا ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں۔ وہ غالب ہے، حکمت والا ہے۔''[2]

8 ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِن مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ وَنُقِرُّ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ﴾

''اے لوگو! اگر تمھیں مرنے کے بعد جی اٹھنے میں شک ہے تو (سوچو)، ہم

[1] المومنون 23:12-14۔ [2] آل عمران 3:6۔

نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ سے، پھر خونِ بستہ سے، پھر گوشت کے لوتھڑے سے۔ جو واضح شکل والا بھی ہوتا ہے اور غیر واضح (ادھوری) شکل والا بھی، تاکہ ہم تمہارے لیے (اپنی قدرت وحکمت) واضح کریں۔ اور جس (نطفے کو) چاہیں ایک ٹھہرائے ہوئے وقت تک رحمِ مادر میں رکھتے ہیں، پھر تمھیں بچپن کی حالت میں دنیا میں لاتے ہیں۔ تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔'' [1]

خلاصہ آیات

- اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا۔ اور ان کی صورتیں جیسی چاہیں بنائیں۔ صورتوں اور رنگوں پر اختیار صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔ ہرگز کسی اور کا نہیں ہے۔
- خالق نے انسان کو نطفہ سے پیدا کیا۔ اسے کامل اور صحیح الأعضاء بنایا۔ انسان کے اندر تعدیل کا خیال رکھا، مثلاً: دونوں آنکھیں، دونوں کان، دونوں ہاتھ، دونوں پیر وغیرہ بنائے اور وہ ایک جیسے رکھے۔ کیونکہ جہاں تعدیل (خوبصورتی) نہ ہو وہاں تقبیح (بدصورتی) جگہ لے لیتی ہے۔ اور یہی معنی ہیں ''احسن تقویم'' کے۔ اور فرمایا: تمھاری شکل وصورت جیسی چاہی بنائی، ساری مخلوقات سے خوبصورت۔ وہ بتادیا کہ اچھی بنائی، بہت ہی اچھی۔ اور یہ ہمارا مشاہدہ بھی ہے۔ سعدی شیرازی رحمہ اللہ نے کیا خوب فرمایا:

وزیں قطرہ لؤلؤ و لالہ کُنَد
وزیں قطرہ صورتِ سرو و بالا کُند

- احسن تقویم سے مراد محض چہرہ اور اس کی خوبصورتی نہیں بلکہ مراد پورا جسم ہے۔ چہرہ بھی اس میں داخل ہے۔ پورا جسم ہی خوبصورت ترین اور سڈول ہے۔ جسمانی و بدنی

[1] الحج 22:5.

حسن و جمال میں کوئی مخلوق انسان جیسی نہیں ہے۔ یہ حقائق و شواہد نظریۂ ڈارون کو اپنے پاؤں تلے کچل رہے ہیں۔ اگر انسان ہو کر کسی کو بندر بننے کا شوق چرّاتا ہو تو اس کی قسمت۔ ہم کسی کی قسمت سے تو لڑائی نہیں کر سکتے۔

- انسانوں کی صورتیں بنانے والا اور انھیں نعمتِ حسن بخشنے والا بھی وہی ایک اللہ ہے۔ اس لیے اس کے ادب و احترام اور اس کی رضا کو ہر گام پیش نظر رکھو۔

- اللہ نے انسان کو نہ صرف حسین ترین شکل دی بلکہ کھانے پینے کے لیے اعلیٰ سے اعلیٰ چیزیں بھی عنایت کیں۔ جن کا تذکرہ قرآنِ حکیم میں متعدد مقامات پر ہوا ہے، مثلاً دیکھیے سورہ عبس 80:24-32، یعنی جیسا اعلیٰ انسان خود ہے، ویسی ہی عمدہ اس کی غذا ہے۔ اس کے برعکس جانوروں کی غذا پھونک، چھلکے، گھاس پھونس بنائی۔ اور انسان کی غذا پھل کے اندر کا گودا اور محفوظ دانے بنائی۔ یہ ہے اللہ، جو تمھارا رب ہے اور بڑی برکتوں والا ہے۔ کیا اب بھی اس کی معرفت میں کوئی شبہ رہ جاتا ہے؟ اگر کوئی شبہ ہے تو اب دور کر لو۔ وہاں بات نہیں بنے گی۔ اور یہ بنائے ہوئے کُل سہارے اوجھل ہو جائیں گے۔

- آدم علیہ السلام کو مٹی کے جوہر سے پیدا کیا اور حوّا علیہا السلام کو ان کی بائیں پسلی سے، پھر بعد والے انسانوں کو نطفہ سے۔

آگے اس کے مدارج بتائے ہیں۔ 'قَرَارٍ مَّكِينٍ' رحم مادر ہے۔ پھر گوشت اور ہڈیوں کو ملا کر بچہ تیار کر دیا۔ ''خَلْقًا آخَرَ'' سے مراد مکمل تیار بچہ ہے۔ جس کے ساتھ سمع و بصر اور احساس و ادراک کی ساری قوتیں ہیں۔ یہاں خالقین سے مراد صانعین (دنیا جہان کے کاری گر) ہیں، یعنی اللہ سب سے اچھا اور باکمال صنعت کار (کاریگر) ہے۔ اس جیسا خالق اور مصوّر کوئی نہیں۔ اگر کوئی اس جیسا ہے تو پیش کرو!!

ماں کے پیٹ (رحم) میں تصویر بنانے والا صرف اللہ ہے۔ لا الٰہ کا یہاں پر مطلب یہ ہے جب اس اکیلے نے یہ سارا کام کیا اس کے ساتھ اور کوئی مصروف کار نہیں رہا، تو وہ اکیلا ہی تمھارا معبود ہے۔ یہ معبود ہونا صرف اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے۔ شروع سے لے کر تا امروز کوئی اور اللہ تعالیٰ کے اس معجز نما اور حیرت انگیز کام میں شریک و دخیل نہیں رہا۔ اگر کوئی رہا ہو تو بتاؤ؟

یعنی قطرۂ منی سے 40 روز کے بعد عَلَقہ گاڑھا خون، پھر اس سے مُضغَہ گوشت کا لوتھڑا بن جاتا ہے۔ مُخَلَّقہ سے مراد کامل بچہ (لڑکا یا لڑکی ہے) اور غیرِ مخلّقہ اس کے برعکس نا تمام بچہ ہے۔ نطفہ سے 40 دن کے بعد علقہ، پھر 40 دن کے بعد مضغہ اور 4 ماہ کے بعد نفخ رُوح ہوتا ہے۔[1]

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اَفَرَاَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ﴾

''کبھی تم نے غور کیا؟ یہ نطفہ جو تم ڈالتے ہو، اسے تم پیدا کرتے ہو یا ہم بنانے والے ہیں؟''[2]

اس کا جواب ایک ہی ہے کہ اس بچے کو بنانے والا صرف ایک اللہ ہے اور کوئی نہیں۔ قرآنِ مجید نے انسان کی تخلیق کے متعلق جو کچھ بیان فرمایا اس کا انسانیت کو قدرے ادراک 1677ء میں ہوا۔ انسانی جنین کا باقاعدہ مطالعہ 1880ء میں کیا گیا اور 1941ء میں پہنچ کر اس کا مطالعہ کسی نتیجے پر پہنچا۔ بہر حال اس وقت ہمیں یہ بتانا ہے کہ ہم سب کا خالق و مصور صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اسے صحیح طور پر پہچانو۔ اسی پہچاننے ہی

1 صحيح البخاري، حديث:3332۔ 2 الواقعة:56:58-59.

سے اس کا مقام و مرتبہ پہچانا جائے گا۔ اور اسی لحاظ سے اس کا ادب بجالایا جائے گا۔

ضروری نوٹ

والد گرامی مولانا حکیم محمد ادریس فاروقی رحمہ اللہ نے اپنے جاری کردہ رسالے ضیائے حدیث میں ''ادب'' کے حوالے سے مضامین کا یہ سلسلہ شروع کیا تھا۔ یہ ان کی زندگی کے چند آخری ماہ تھے۔ راقم ان دنوں ایڈیٹر تھا۔ راقم نے والد گرامی رحمہ اللہ سے عرض کیا: ابو جان! مضامین کا یہ سلسلہ بہت طویل ہے۔ اس بحث کو سمیٹتے ہوئے اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب پر لکھیے۔ والد گرامی رحمہ اللہ نے بڑی خوش دلی سے میری درخواست قبول کی اور ادب رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر مضمون لکھنا شروع کر دیا۔ اس طرح ''ادب الٰہی'' کا عنوان تشنہ تکمیل رہ گیا۔ کبھی میں سوچتا ہوں کہ میں انھیں مرضی کے مطابق لکھنے دیتا مگر پھر خیال آتا ہے کہ اللہ کے فیصلے اچھے ہوتے ہیں۔ اس نے اپنے محبوب کا ذکر بلند کیا ہے اور وہ محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے تذکرے سے خوش ہوتا ہے، تبھی تو اذان میں، نماز میں اور سب سے بڑھ کر کلمے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے:

ذکر خدا تو کرے مگر ذکر مصطفیٰ ﷺ نہ کرے
میرے منہ میں ہو ایسی زباں خدا نہ کرے

بہر حال ''حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کا ادب'' مولانا محمد ادریس فاروقی رحمہ اللہ کی زندگی کا آخری مضمون بن گیا۔ یہ مضمون قارئین آئندہ صفحات میں ملاحظہ کریں گے۔ اللہ مولانا مرحوم کو جوارِ رحمت اور نبوی شفاعت نصیب فرمائے۔ آمین

(محمد نعمان فاروقی)

سیدنا محمد ﷺ اور دیگر انبیائے کرام علیہم السلام کا ادب

وفات سے ایک دن پہلے مکمل ہونے والا مضمون

اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ﴾

''تو وہ لوگ جو آپ علیہ السلام پر ایمان لائے اور آپ کو قوت دی اور آپ کی مدد کی......''[1]

پہلے آپ پڑھ چکے ہیں کہ ادب میں سب سے پہلا حق اللہ تعالیٰ کا ہے چونکہ وہ ہمارا خالق، مالک، رازق، منعم، محسن، مربی غرض سب کچھ ہے اس لیے اس کا ادب بجا لانا از حد ضروری ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آدمی اس کی خالص توحید میں ذرا سی بھی نجاستِ شرک کی آمیزش نہ کرے۔ اس پر اور بھی لکھا جا سکتا ہے۔ سر دست اب ادب رسول ﷺ پر گذارشات عرض خدمت کی جاتی ہیں۔

قرآن وحدیث کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مخلوقات میں سب سے بلند مرتبہ حضرات انبیاء و مرسلین علیہم السلام کا ہے جن کے ادب و احترام کو ملحوظ خاطر رکھنا نہایت

1. الأعراف 157:7.

ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں سے ہم کلام ہونے اور انھیں اپنا پیغام پہنچانے کے لیے سلسلۂ نبوت و رسالت شروع فرمایا۔ اس سلسلۂ مبارکہ کے پہلے نبی حضرت آدم علیہ السلام اور آخری حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔

انبیاء و مرسلین علیہم السلام کا ادب یہ ہے کہ سب کا دل و جان سے اقرار کریں۔ ان کی تعلیمات سے ممکنہ استفادہ کریں۔ ان سے عقیدت و محبت رکھیں۔ ان کا اچھا ذکر کریں۔ ان کے حالات و واقعات کا مطالعہ کریں۔ ہمیشہ ان کا ادب سے نام لیں۔ ٹیڑھا نام بلانا تو عام آدمی کا بھی جائز نہیں، چہ جائیکہ حضرات انبیاء علیہم السلام کا بلایا جائے۔ بعض علاقوں اور قوموں میں نام بگاڑ کر بلانے کی عادت ہوتی ہے، مثلاً اشرف کو اَچھُّو، اکرم کو اَکُّو، عبدالرشید کو شیدا، کرم الٰہی کو کرمُوں وغیرہ کہتے ہیں۔ اسی طرح جن بچوں اور بڑوں کے نام انبیاء علیہم السلام کے ناموں پر ہوتے ہیں وہ ان کے نام بگاڑنے میں دریغ نہیں کرتے۔ مثلاً موسیٰ نے کہا تھا، کو موسے نے کہا تھا۔ عیسیٰ نے دوکان بند کر دی کو عیسے نے دکان بند کر دی۔ اور بڑے دکھ کی بات یہ ہے کہ اعلیٰ و مبارک اسم گرامی ''محمد'' کو بگاڑنے میں بھی کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے (ﷺ)۔

یاد رکھیے! یہ حضرت نبی کریم ﷺ کی بے ادبی اور بڑا گناہ ہے۔ مسلمان پہلے حضرت خاتم الانبیاء ﷺ کے خود ادب آداب سیکھیں، پھر دوسروں کو سکھائیں، جو اس دولت سے خود محروم ہو وہ دوسروں کو کیا سکھا سکتا ہے؟

قرآن مجید کی روشنی میں ادب نبوی کی تعلیمات[1]

ایک خاص حلقے کی طرف سے اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی

[1] یہ ذیلی عنوان صفحہ 66 تک راقم کی طرف سے اضافہ ہے۔ (محمد نعمان فاروقی)

بعثت کا مقصد یہ ہے کہ آپ ﷺ کی اطاعت کی جائے اور بس!! مگر اللہ تعالیٰ نے بعثت کے مقصد میں تعظیم وتوقیر کو بھی شامل فرمایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا ۝ لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ ﴾

''بے شک ہم نے آپ کو گواہ، خوشخبری دینے والا اور متنبہ کرنے والا بنا کر بھیجا ہے تاکہ (اے لوگو!) تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور انھیں قوت دو اور ان کی توقیر کرو۔'' [1]

اس آیت میں ''ہٗ'' ضمیر کے متعلق مفسرین کی مختلف آراء ہیں۔ بعض کا کہنا ہے کہ اس سے مراد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ کچھ اہل علم کہتے ہیں: اس سے مراد اللہ تعالیٰ ہیں۔ کئی ایک کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس سے مراد اللہ اور اس کے رسول ﷺ ہیں۔ اللہ کو قوت دینے سے مراد ہوگا اس کے دین کو قوت دینا۔ مگر بہت ہی کم مفسرین ہیں جنھوں نے یہاں ضمیر سے آپ ﷺ کو مراد نہ لیا ہو۔ یہ آیت زیر بحث موضوع پر ایک اصول کی حیثیت رکھتی ہے۔

ـ قرآن مجید میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے آگے بڑھنے سے روکا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾

''اہل ایمان! اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے آگے نہ بڑھو۔'' [2]

یہ آیت بھی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ادب پر دلالت کناں ہے۔ مطلب یہ

[1] الفتح 9:48۔ [2] الحجرات 49:1۔

ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت ایک چوٹی ہے جو اس چوٹی سے آگے بڑھنے کی کوشش کرے گا وہ نیچے کی طرف ہی آئے گا۔

▪ اسی طرح ادب رسول اللہ ﷺ پر یہ آیت بھی بہت وسیع مفہوم رکھتی ہے:

﴿يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ﴾

"اے اہل ایمان! اپنی آوازوں کو نبی ﷺ کی آواز سے بلند نہ کرو اور آپس میں ایک دوسرے سے بات کی طرح آپ علیہ السلام سے اونچی بات نہ کرو کہیں تمھارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تمہیں شعور تک نہ ہو۔"[1]

اتنا بڑا ادب کہ آپ ﷺ کی موجودگی میں کسی اور سے گفتگو کرتے ہوئے بھی آواز اونچی نہ ہو اور آپ ﷺ سے ہم کلام ہوتے ہوئے بھی آواز بلند نہ ہو۔ اور اس کا خیال نہ رکھنے پر اعمال کے برباد ہونے کی وعید۔ آیئے! تاریخ کے ورق الٹتے ہیں۔ جب یہ آیت اتری تو "خطیب النبی ﷺ" سیدنا ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے سے احتیاط کرنے لگے۔

نبی ﷺ نے جب انھیں نہ دیکھا تو ان کے بارے میں دریافت فرمایا۔ ایک صحابی عرض کرنے لگے: اللہ کے رسول! میں ان کے بارے میں معلومات لاتا ہوں۔ وہ صحابی جب ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کے ہاں پہنچے تو وہ سر جھکائے بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا: آپ کو کیا ہوا؟ ثابت کہنے لگے: بڑی مشکل میں ہوں۔ دراصل ثابت رضی اللہ عنہ کی آواز

[1] الحجرات 49:2.

قدرے اونچی تھی۔ انھیں خدشہ تھا کہ ان کی آواز آپ ﷺ کی آواز سے بلند نہ ہو جائے اور ان کے عمل ضائع نہ ہو جائیں اور وہ جہنم کے حقدار نہ بن جائیں۔ وہ صحابی ان کے یہ احساسات لے کر بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((اِذْهَبْ اِلَيْهِ فَقُلْ لَهٗ: إِنَّكَ لَسْتَ مِنْ اَهْلِ النَّارِ، وَلٰكِنَّكَ مِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ)).

”جاؤ اور انھیں کہہ دو کہ تم جہنم والوں سے نہیں بلکہ جنت کے راہیوں میں سے ہو۔“[1]

صحابی رسول سیدنا ثابت رضی اللہ عنہ کا عقیدہ بالکل درست تھا مگر رسالت مآب ﷺ کے ادب و احترام کا جذبہ بھی اسی قدر موجزن تھا۔ انھوں نے شرک و کفر یا اختراع و بدعت تو نہیں کی تھی، پھر وہ کیوں اتنے محتاط ہو گئے؟ جبکہ ان کی آواز فطری طور پر اونچی تھی۔ اس لیے تو آپ ﷺ نے انھیں اس بات کی ضمانت دیدی کہ وہ جنتی ہیں جس سے یہ بات لازمی سمجھ آتی ہے کہ ان کے اعمال رائیگاں نہیں جائیں گے۔ عقیدے کی درستگی کے ساتھ ساتھ ادب رسول اللہ ﷺ بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔

یہی آیت جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے کانوں سے ٹکرائی تو اس کے بعد وہ آپ ﷺ سے اتنی دھیمی گفتگو کرنے لگے کہ خود رسول اللہ ﷺ کو (بار بار پوچھ کر) بات سمجھنی پڑتی۔[2]

❏ قرآن مجید میں آپ ﷺ سے سرگوشی کے ادب میں یہ بھی بیان ہوا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ

---

[1] صحیح البخاري، التفسیر، سورة الحجرات، حدیث:4846۔ [2] صحیح البخاري، التفسیر، حدیث:4845.

نَجْوَاكُمْ صَدَقَةً ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاَطْهَرُ﴾

''اہل ایمان! جب تم رسول اللہ ﷺ سے سرگوشی کرنے لگو تو اپنی سرگوشی سے پہلے صدقہ دیا کرو۔ یہ تمہارے لیے بہت بہتر اور زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے۔''[1]

پھر اس آیت کا حکم لوگوں پر مشقت اور مشکل کی وجہ سے منسوخ ہو گیا۔ پر منسوخ ہوتے ہوئے بھی یہ پیغام دے گیا کہ اللہ کے ہاں اپنے پیغمبر ﷺ کا بہت مقام ہے۔ آپ ﷺ کو پہنچنے والی معمولی سے اذیت بھی اللہ تعالیٰ کو گوارہ نہیں۔ اس لیے اہل ایمان! تم بارگاہ نبوی کا خیال رکھنا اور آداب بجا لانا۔ ایک وقت تک بارگاہ نبوی کے آداب کی اس انداز سے تربیت ہوتی رہی۔ جب ان میں یہ شعور پیدا ہو گیا تو بعد میں سرگوشی سے پہلے صدقہ دینے کا حکم منسوخ ہو گیا۔

▪ سیدہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا جب ام المومنین بنیں تو آپ ﷺ نے اگلے دن ولیمے کا اہتمام کیا۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ لوگوں کو دعوت دینے پر مامور تھے۔ لوگ آتے گئے اور فارغ ہو کر واپس جاتے رہے۔ ان میں کچھ لوگ وہیں بیٹھ گئے اور آپس میں گفتگو کرنے لگ گئے۔ آپ ﷺ تشریف لائے اور پھر واپس چلے گئے مگر وہ بیٹھے ہی رہے تو اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری:

﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّآ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰىهُ وَلٰكِنْ اِذَا دُعِيْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا﴾

''اہل ایمان! تم نبی ﷺ کے حجروں میں داخل نہ ہوا کرو مگر جب تمھیں کھانے

[1] المجادلة 12:58۔

کی دعوت دی جائے اس حال میں کہ کھانا پکنے کا انتظار کرنے والے نہ ہو پھر جب تمھیں بلایا جائے تو داخل ہو جاؤ تو جب کھا لو تو پھر (وہاں سے اٹھ کر) پھیل جاؤ۔"[1]

یہ بھی آداب رسالت مآب ﷺ کا ایک انتہائی لطیف پہلو ہے کہ اہل ایمان کی طرف سے آپ علیہ السلام کو اتنی معمولی سی گرانی بھی نہ گزرے۔ جو لوگ آپ ﷺ کو محض ایک قاصد یا پیغام رساں سمجھتے ہیں ان کے لیے ان آیات میں بہت سے اسباق ہیں۔ ادب آداب کے اس قدر لطیف پہلو ایک قاصد کے نہیں بلکہ "محبوب" کے ہوتے ہیں۔

▪ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ کے بارے میں ایسے الفاظ کہنے سے بھی منع فرما دیا جن سے آپ ﷺ کی تنقیص کا کوئی ادنی سا شبہ بھی پڑتا ہو۔ ہوا یوں کہ یہود نے جب آپ ﷺ سے کہنا ہوتا کہ ہماری بات سنیں تو "اِسْمَعْ لَنَا" کی بجائے "راعنا" کہتے اور اس کا مادہ رعایت کی بجائے "رعونت" بناتے اور زبان کو ذرا گھما کر کہتے تاکہ نعوذ باللہ آپ ﷺ کی اہانت کی مذموم کوشش کی جا سکے۔ "راعنا" کا لفظ مسلمانوں میں بھی رائج تھا تو اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو ایسے مشتبہ لفظ ہی سے روک دیا کہ وہ آپ ﷺ کے متعلق استعمال نہ کریں، چنانچہ فرمایا:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انْظُرْنَا﴾

"اے اہل ایمان! تم نے "راعنا" نہیں بلکہ "انظرنا" کہنا ہے۔"

یہ آیت اہل ایمان کی تربیت کرتی رہے گی کہ تم نے کوئی بھی ایسا لفظ نہیں بولنا، کوئی

[1] الأحزاب 53:33.

ایسی سوچ نہیں اپنانی، کوئی ایسا طرزِ عمل اختیار نہیں کرنا، کوئی ایسا نظریہ نہیں رکھنا اور کوئی ایسا تعلق نہیں رکھنا جس سے آدابِ رسالت مآب میں ادنیٰ سا فرق بھی آتا ہو۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر ادب نبوی ﷺ کی اس تربیت کا اثر

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو شب و روز بارگاہِ الٰہی اور بارگاہِ نبوی کے ادب کی تربیت لے رہے تھے اس کا ان کی زندگیوں پر اثر بھی تھا۔ ایک ہی بات ہوا کا رخ بتا رہی ہے۔ وہ یہ کہ نبی کریم ﷺ کے ہاں تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آتے رہتے تھے۔ اپنے مسائل کے لیے اپنے فیصلوں کے لیے اور اپنی ضروریات کے لیے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ جو نبی ﷺ کے خادم تھے، فرماتے ہیں کہ

((أَنَّ أَبْوَابَ النَّبِيِّ ﷺ كَانَتْ تُقْرَعُ بِالْأَظَافِيرِ)).

”بے شک نبی ﷺ کے گھر کے دروازوں پر ناخنوں سے دستک دی جاتی تھی۔“[1] یعنی دروازے پر پورا ہاتھ بھی نہیں مارتے تھے۔

افضلیتِ مصطفیٰ ﷺ کا اظہار احتیاط کے ساتھ

حضرات انبیاء علیہم السلام کا یوں تذکرہ کرنا جس میں ان کا آپس میں مقابلہ یا دوسرے نبی کے لیے ذم یا اہانت کا پہلو پایا جائے، روا نہیں۔ احادیث صحیحہ میں سوچ اور گفتگو کے ایسے اسلوب کو دوسرے نبی کی بے ادبی ہونے کی وجہ سے پسند نہیں کیا گیا۔

صحیح بخاری کی حدیث مبارکہ ہے:

((لَا تُفَضِّلُوا بَيْنَ الْأَنْبِيَاءِ)).

[1] الأدب المفرد: 371/1، حدیث: 1080، و السلسلة الصحيحة: 91/5، حدیث: 2012.

"انبیائے کرام علیہم السلام کے مابین مجھے فضیلت نہ دو۔"[1]

لہٰذا ہمیں احتیاط کرنی چاہیے۔ کسی بھی نبی کی ادنیٰ سی بے ادبی کرنے سے بھی پرہیز کرنا چاہیے۔

انبیاء علیہم السلام کا ادب سے نام لیں۔ اور ان کے نام مبارک کے ساتھ علیہ السلام کہیں۔ اس کے ساتھ ایک بات یہ بھی نہ بھولیے کہ جس طرح برحق انبیاء و مرسلین پر ایمان لانا ضروری ہے اسی طرح مرزا قادیانی قسم کے جھوٹے نبیوں کا انکار اور تکذیب کرنا بھی لازمی ہے۔ یہ عقیدے کا معاملہ ہے بات گول مول کر دینا اور اہمیت نہ دینا بالکل درست نہیں ہے۔

تمام مسلمان متفق ہیں کہ جملہ انبیاء و مرسلین علیہم السلام میں سب سے اونچا درجہ سیدنا و مولانا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا ہے۔ آنحضرت ﷺ کا مرتبہ اوّلین و آخرین بلکہ اللہ کی جمیع مخلوقات سے فائق اور بلند ہے۔ آپ ﷺ کے سراقدس پر سب نبیوں کی امامت کا تاج اور قیادت کا سہرا سجا دیا گیا۔ اور آپ ﷺ کو تاج و تخت ختم نبوت کا وارث بنا دیا گیا۔

آپ علیہ السلام کا ذکر مبارک پہلی کتب میں بھی موجود ہے اور قرآنِ مجید میں بھی ہے۔ اور بکثرت ہے۔ آپ ﷺ کی نبوت اور رسالت پر ایمان لانے اور آپ کی نصرت کرنے پر جملہ انبیاء علیہم السلام سے عہد لیا گیا۔[2] آپ کی تعریف اللہ تعالیٰ نے فرمائی۔ جبرائیل علیہ السلام نے کی۔ صحابہ و اہل بیت رضی اللہ عنہم نے کی۔ دوستوں نے کی دشمنوں نے کی۔ سب ہی آپ ﷺ کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں۔

[1] صحیح البخاري، أحادیث الأنبیاء، حدیث: 3414۔ [2] دیکھیے: آل عمران 3:81.

قرآنِ حکیم میں متعدد انبیاء و مرسلین علیہم السلام کا بیان ملتا ہے، مگر سب سے زیادہ ذکر جمیل آپ ﷺ کا پایا جاتا ہے۔ اس موقع پر بہت سے اہل علم وقلم نے لکھا، یعنی صرف قرآنِ حکیم سے آپ کے فضائل ومحاسن اور سیرت وسنت پر آیات اور ان کی خوبصورت تشریحات رقم کیں۔ (راقم عاجز بھی اس سعادت میں حصہ لے رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ بندہ کی یہ سعی مشکور فرمائے۔ ''جمال رسول ﷺ قرآن کی نظر میں۔'' اور ''کمال رسول ﷺ حدیث کی نظر میں'' تقریباً 4،4 سو صفحات پر مشتمل کتب زیرِ تکمیل ہیں۔)[1]

جملہ انبیاء علیہم السلام میں وہ آپ ﷺ ہی ہیں کہ جن کی پوری حیات طیبہ کا لمحہ لمحہ محفوظ ہے، الحمد للہ۔ آپ ﷺ کی مرویات بھی محفوظ ہیں اور رُواۃ بھی۔ یہ شرف نبی ہو یا غیر نبی کسی اور کو آج تک حاصل نہیں ہوا اور نہ ہوگا۔

آپ ﷺ کی بعثت کے بعد سب انس و جانّ آپ کی امت میں شامل ہیں۔ جن خوش نصیبوں نے آپ کے پیغام کو مان لیا وہ امتِ اجابت (دعوت کو قبول کرنے والے) کہلائے، جو پس وپیش سے کام لے رہے ہیں وہ امتِ دعوت ہیں۔ فی الوقت جس نبی کی تبلیغ و دعوت علی وجہ البصیرہ سبک روی سے پھیل رہی ہے وہ آپ ﷺ ہی ہیں۔

جس قدر اصحاب علم وفضل اور سر فروش وسربکف مجاہد ہوئے ہیں آپ ﷺ کے پیروکار ہوئے ہیں۔ اتنے مہپارے کسی اور نبی کے نہیں ہوئے۔ آپ ﷺ کی امت میں آسمان علم وفضل کے جس قدر درخشاں اور تاباں ستارے پائے جاتے ہیں اتنے کسی اور نبی کی امت میں نہیں ہیں۔ ایک ایک عالِم اور اِسکالر نے بستانِ ادب وفن میں

[1] محترم مؤلف رحمہ اللہ اپنے اس مسودے کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکے۔ جہاں تک ہوسکا اسے مکمل کر کے شائع کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ان شاء اللہ۔

بوقلموں پھول کھلائے ہیں کہ باید وشاید۔

آپ ﷺ کے اہل بیت رضی اللہ عنہم کا جس اہتمام سے قرآن مجید میں ذکر آیا ہے وہ انفرادی شان کا حامل ہے۔ یہی حال آپ ﷺ کے ذی شان صحابہ رضی اللہ عنہم کا ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کی عظمت کا پھریرا کچھ ایسا لہرایا جو نورِ نیرّین لہراتا رہے گا۔

آپ ﷺ کی ذات اقدس منہجِ رشد و ہدایت ہے جہاں سے امن و سلامتی اور مہر و وفا کے سوتے پھوٹے، بنجر زمینوں نے حیاتِ نو پائی، خزاں رسیدہ چمن بہارِ تازہ سے ہمکنار ہوئے، خوابیدہ بخت بیدار ہوئے، بجھے ہوئے چہروں کی طلعت زیبائی سے دیار واَمصار کی تابانیاں دو چند ہو گئیں۔

آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس اور آپ کے جمال و کمال پر اس قدر کتب طبع ہوئیں اور ہر زبان میں طبع ہو کر اقطاعِ عالم میں پھیلیں کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ اور بحمد اللہ یہ سلسلہ نورانی ہنوز جاری ہے، اور بفضلہٖ جاری رہے گا۔ آپ ﷺ کی ذات والا صفات پر نثر میں بھی لکھا گیا اور نظم میں بھی۔ اور اس قدر نعتیں لکھی گئیں کہ جن کا اندازہ ہی نہیں۔ (یہ الگ بات ہے کہ وہ کیسی ہیں؟)

مختصر یہ کہ آپ علیہ السلام امام المرسلین بھی ہیں رحمۃ للعالمین بھی، ساقی کوثر بھی ہیں شافعِ محشر بھی۔ امام الحرمین بھی ہیں نبی القبلتین بھی۔ انسان اکمل بھی ہیں رہبرِ کامل بھی۔ آپ ﷺ کا مولد بھی افضل ہے مدفن بھی اعلیٰ، اخلاق بھی منفرد، تعلیم بھی یگانہ، جنس بھی بہترین، خاندان بھی وحید العصر، سنت بھی بے عدیل، منہج بھی بے مثیل، مجاہد اعظم بھی امام اعظم بھی۔ (امام اعظم کا معنی ہے سب سے بڑا امام اور وہ علی الاطلاق حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے؟) آپ ﷺ فاتحِ اعظم بھی ہیں اور مقنن لاثانی بھی۔ آپ ﷺ کا ذکر مبارک اتنا پیارا اور اتنا دراز ہے کہ اس کا استقصاء و

احاطہ کسی کے بس میں نہیں۔ سچ کہا کسی نے ؎

زندگیاں بیت گئیں اور قلم ٹوٹ گئے
تیرے اوصاف کا اِک باب بھی پورا نہ ہوا

سورۂ الاعراف آیت 157 میں اہلِ ایمان کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: ''یہ وہ لوگ ہیں جو ایسے رسول نبی اُمّی کا اتباع کرتے ہیں جن کو وہ لوگ اپنے پاس توراۃ و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ وہ نیک باتوں کا حکم فرماتے ہیں اور بری باتوں سے منع کرتے ہیں۔ پاکیزہ چیزوں کو حلال بتاتے ہیں اور گندی چیزوں کو ان پر حرام فرماتے ہیں۔ اور ان لوگوں پر جو بوجھ اور طوق تھے ان کو دور کرتے ہیں۔ جو لوگ اس نبی پر ایمان لاتے ہیں اور ان کی حمایت اور مدد کرتے ہیں اور اس نور کا اتباع کرتے ہیں جو ان کے ساتھ بھیجا گیا ہے، ایسے لوگ پوری فلاح پانے والے ہیں۔''

آپ دعائے خلیل علیہ السلام اور نوید مسیحا ہیں۔ ﴿اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ کی شان کے حامل، سراج منیر یعنی آفتاب و ماہتاب کی روشنی اور جلال و جمال لیے ہوئے ہیں۔ پہلے انبیاء علاقائی داعی تھے مگر آپ ﷺ آفاقی بن کر تشریف لائے۔ اور آپ کو بہت سی خصوصی صفات سے نوازا۔ جن میں دوسرا کوئی نبی بھی شریک نہ تھا۔ مثلاً آپ کے لیے پوری زمین کو جائے سجدہ و باعث طہور بنا دیا گیا۔ گیارہ نکاح کیے جن کی بدولت عرب قبائل سے رابطہ ہوا اور اشاعت دین میں مدد ملی۔ رحمۃ للعالمین، ساقی کوثر اور صاحب معراج بن کر آئے۔ مقام محمود، شفاعتِ کبریٰ، اسوۂ حسنہ، دین کامل اور خلق عظیم کے حامل بن کر آئے۔ مطاع اور متبوع بن کر رونق افروز ہوئے۔ وہ داعی و خطیب بن کر مبعوث ہوئے کہ عرب و عجم میں اپنے سچے معبود کی توحید کے ڈنکے بجا دیے۔

آپ ﷺ کی محبت کو ہمارے لیے فرض قرار دیا گیا۔ اور ہمارے لیے یہ ضروری

ہے کہ ہم ساری مخلوقات اور دنیا جہان کی ہر چیز سے زیادہ آپ ﷺ سے رشتۂ عقیدت و محبت استوار رکھیں۔

اربابِ علم نے سچی محبت کی کچھ علامات بھی بیان فرمائی ہیں جنھیں یاد رکھنے کی ضرورت ہے۔ قاضی عیاض علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

''نبی کریم ﷺ کی سنت (طریقے) کی نصرت و تائید کرنا، آپ پر نازل کردہ شریعت کا دفاع کرنا اور آپ ﷺ پر اپنی جان و مال فدا کرنے کی تمنا کرنا آپ کی محبت میں سے ہے۔''[1]

حافظ ابن حجر عسقلانی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: ''اگر ممکن ہو تو آپ ﷺ کی زیارت دنیا جہان کی ہر دولت و نعمت سے زیادہ عزیز ہو۔ علاوہ ازیں آپ کی سنت کی حمایت و تائید، آپ پر نازل کردہ شریعت کا دفاع، اور شریعت کے مخالفین کی سرکوبی شامل ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی اس (علامتِ حُبِّ نبوی) میں داخل ہے۔''[2]

علامہ عینی رحمہ اللہ اسی موضوع پر فرماتے ہیں: ''اس بات کو اچھی طرح سمجھ لو کہ رسول کریم ﷺ سے محبت آپ کی تابعداری کرنے اور نافرمانی ترک کرنے کا ارادہ ہے۔ اور یہ اسلام کے واجبات میں سے ہے۔''[3]

تمام علماء نے آپ ﷺ کی محبت کی دو بڑی بنیادی علامات بیان فرمائی ہیں: اطاعت اور اتباع۔ جملہ صحابہ و اہل بیت رضی اللہ عنہم میں یہ اعلیٰ پیمانے پر پائی جاتی تھیں۔ اگر ہمارے اندر یہ موجود ہیں تو اللہ کا شکر بجا لائیں۔ اگر کچھ کم ہیں یا بالکل نہیں ہیں تو اوّلین فرصت میں انھیں اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ جامع ترمذی کی ایک حدیث میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

[1] ماخوذ از شرح النووی:16/2۔ [2] فتح الباري:59/1۔ [3] عمدة القاري:144/1.

((لَمْ يَكُنْ شَخْصٌ أَحَبَّ إِلَيْهِمْ مِنْ رَّسُولِ اللّٰهِ ﷺ)).

''صحابہ رضی اللہ عنہم کے نزدیک رسول اللہ ﷺ سے زیادہ کوئی ہستی محبوب نہ تھی۔''[1]

کفار کے سفیر عروہ بن مسعود ثقفی کا چشم دید نظارہ پڑھنے کے قابل ہے، عروہ کہتا ہے:

((وَاللّٰهِ! إِنْ رَأَيْتُ مَلِكًا قَطُّ يُعَظِّمُهُ أَصْحَابُهُ مَا يُعَظِّمُ أَصْحَابُ مُحَمَّدٍ مُحَمَّدًا)).

''میں نے کبھی کسی بادشاہ کو نہیں دیکھا کہ اس کے درباری اس کی اتنی تعظیم کرتے ہوں جتنی محمد ﷺ کے ساتھی محمد ﷺ کی کرتے ہیں۔''[2]

زید بن دثنہ رضی اللہ عنہ کا وہ قول کس قدر ایمان افروز ہے جو اپنی شہادت کے وقت انھوں نے کہا:

((وَاللّٰهِ! مَا أُحِبُّ أَنَّ مُحَمَّدًا فِي مَكَانِهِ الَّذِي هُوَ فِيهِ تُصِيبُهُ شَوْكَةٌ تُؤْذِيهِ)).

''اللہ کی قسم! میں تو یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ آپ جہاں ہیں، وہاں آپ ﷺ کو کوئی کانٹا بھی چبھے۔''

ابوسفیان یہ جواب سن کر پکار اٹھا:

((مَا رَأَيْتُ فِي النَّاسِ أَحَدًا يُحِبُّ أَحَدًا كَحُبِّ أَصْحَابِ مُحَمَّدٍ مُحَمَّدًا)).

''میں نے کسی کو کسی سے ایسی محبت کرتے نہیں دیکھا جیسی محبت محمد ﷺ کے

[1] جامع الترمذي، الأدب، باب ماجاء في كراهية قيام الرجل للرجل، حديث: 2754۔
[2] صحيح البخاري، الشروط، باب الشروط في الجهاد، حديث: 2731-2732.

ساتھی محمد ﷺ سے کرتے ہیں۔''[1]

قارئین! عُروہ اور ابوسفیان کے مذکورہ دونوں استشہاد زمانہ کفر کے تھے جس سے یہ اندازہ لگانا کوئی مشکل نہیں کہ صحابہ و اہل بیت رضی اللہ عنہم کے منبع قلب میں حبِّ رسول ﷺ کے ٹھنڈے میٹھے اور مجلّٰی و مصفّٰی چشمے کس طرح ابل رہے تھے۔ اللہ ہمیں بھی اس کیف سے بہرہ ور فرمائے۔ (آمین)

ہمارے لیے بہت ضروری ہے کہ ہم نفاق، بدعت، غلو، جمود، تعصب اور آپ ﷺ کی طرف جھوٹی باتیں منسوب کرنے سے دور رہیں۔ نفاق سے مراد یہ ہے کہ اوپر سے محبت ظاہر کی جائے مگر اندر محبت سے خالی ہو۔

بدعت دین میں نئے کام کو کہتے ہیں۔ بدعتی کو سنتِ رسول ﷺ پر اطمینان قلب حاصل نہیں ہے۔ آخر یہ دین میں نیا طریقہ کیوں ایجاد کرتا ہے؟ اسے کون سی ضرورت پیش آتی ہے؟

غلو سے مراد مبالغہ ہے۔ محبت میں مبالغہ ہو جانا قدرتی امر ہے۔ مگر خوب سمجھ لیجیے، بارگاہِ نبوی میں اس کی اجازت بھی نہیں۔ اس کا ثواب نہیں بلکہ گناہ ہے۔

جمود اپنے آبائی اور خود ساختہ طریقے پر ایسا جم جانا ہے کہ ''زمین جُنبد، نہ جُنبد گل محمد۔'' قرآن اور احادیث صحیحہ وصریحہ سے محکم دلائل دیکھ کر بھی ایک انچ اِدھر اُدھر نہ ہونا تعصب، ضد اور طرفداری کو کہتے ہیں۔ مراد ہے بے جا حمایت اور بے جا طرفداری۔ مثلاً اپنا کوئی گروہ بنا لیا اور سوچے سمجھے بغیر اس کی بے جا حمایت اور طرفداری شروع کر دی۔ بہت سے لوگوں نے مذہبی اور سیاسی لائن میں اپنے اپنے

[1] تاریخ الطبري: 2/216.

قائد، امام اور پیر بنا رکھے ہیں۔ وہ کسی قیمت پر ان سے منحرف ہونے کے لیے تیار نہیں۔ آنحضرت ﷺ کی طرف کوئی جھوٹی بات یا واقعہ منسوب کرنا، بڑا جرم ہے۔ ہم میں سے کوئی شخص اپنی طرف جھوٹی بات کی نسبت برداشت نہیں کرتا، رسول اکرم ﷺ نے بھی اپنی طرف دروغ کی نسبت گوارا نہیں فرمائی۔ کیوں کہ اس طرح دین کا خاکہ بدل جاتا ہے بلکہ آپ ﷺ کی بے ادبی بھی ہے۔ حدیث مبارکہ میں اس جرم کی سزا جہنم بتلائی گئی ہے۔ اللّٰھم احفظنا منه۔

چنانچہ ارشاد ہے:

((مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ)).

''جس نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ باندھا تو اسے اپنا ٹھکانا جہنم میں سمجھ لینا چاہیے۔''[1]

قارئین! جس طرح حضور اکرم ﷺ کا ادب و تعظیم بجالانا بہت بڑا اعزاز اور بے حد کارِ ثواب ہے، ٹھیک اسی طرح آپ کی بے ادبی کا ارتکاب بہت بڑی خجالت و رذالت اور حد درجہ گناہ ہے۔ اب آخر مضمون میں بے ادبی کی 50 سے زائد عام اور خاص صورتوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جس سے مقصود مسلمانوں کو ہر طرح کی بے ادبی سے بچانا ہے۔ آپ ان سطور کا غور سے مطالعہ فرما کر تہہ تک پہنچیں اور آپ ﷺ کی بے ادبی سے بچنے کی پوری کوشش کریں۔

بے ادبی کی چند بھیانک صورتیں

1. آنحضرت ﷺ کو نام لے کر بلانا۔

[1] صحیح مسلم، المقدمة، باب تغليظ الكذب...، حدیث:3.

2 آپ ﷺ کے نام رقعے اور درخواستیں بھیجنا۔

3 اپنی آواز کو آپ ﷺ کی آواز سے بلند کرنا۔

4 احکام میں آپ ﷺ سے آگے بڑھنا۔

5 آپ کی اطاعت سے گریز کرنا۔آپ کی اتباع سے دور رہنا۔

6 شرک و بدعت کا ارتکاب کرنا۔

7 امتیوں کو آپ ﷺ سے بڑھا دینا یا برابر کر دینا۔

8 آپ ﷺ کی طرف جھوٹی بات یا موضوع حدیث کو منسوب کرنا۔

9 آپ ﷺ کو کسی بھی طرح ہدفِ تنقید بنانا۔

10 احادیث یا ان کی اہمیت کا انکار کرنا۔

11 قرآن یا حدیث میں تاویل وتحریف سے کام لینا۔

12 سنت سے اِعراض یا سنت کا استخفاف کرنا۔

13 آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم و خاندان سے دُوری اختیار کرنا۔

14 آپ ﷺ کے مخالفین سے روابط رکھنا اور انھیں عزت کی جگہ دینا۔

15 آپ ﷺ کے مشن کے اِجراء و اِحیاء میں کوئی رول ادا نہ کرنا، جیسے آپ ﷺ سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔

16 آپ ﷺ کے منہج کو اختیار کرنے میں پس وپیش کرنا۔

17 مرتکبینِ شرک و بدعت اور اہل ہوا کی خم نہ ٹھونکنا۔

18 قرآن وحدیث کی مجالس سے استغناء برتنا۔

19 آپ ﷺ کی خاطر کسی بھی قربانی سے دریغ کرنا۔

20 آپ ﷺ کے پیاروں اور آپ ﷺ کی پسندیدہ چیزوں اور اداؤں سے نفرت کرنا۔

21 جن لوگوں اور جن چیزوں سے آپ ﷺ نے نفرت فرمائی ان کو پسند کرنا۔

22 آپ ﷺ کے ذکر مبارک کو عام کرنے کا شوق نہ ہونا، بلکہ اس کا طبع پر شاقّ گزرنا۔

23 درود وسلام نہ پڑھنا اور اسے معمولی جاننا۔

24 روضہ رسول ﷺ کی زیارت کا مطلق شوق نہ ہونا۔

25 آپ کے اسوہ وسیرت سے ہر پہلو استغناء برتنا۔

26 کسی بھی مسئلہ میں آپ کو حاکم نہ بنانا۔

27 آپ ﷺ کے اسم مبارک، نامہ مبارک یا حدیث مبارک کو پھاڑنا یا گرانا، یا زمین پر گرے پڑے نام مبارک کو نہ اٹھانا۔

28 آپ ﷺ کی ذات اقدس میں غلو کرنا، آپ ﷺ کی ادعیہ و اَوراد یا آپ ﷺ کی بتائی ہوئی عبادات کے الفاظ اور طریقے میں کمی بیشی کرنا۔

29 ادب کے نام پر آپ میں اللہ تعالیٰ کی صفات کو ثابت کرنا۔

30 جو شرکیہ و بدعیہ باتوں کا انکار کرے اسے حقیر جاننا اور اس سے بغض رکھنا۔

31 اپنی محافل ومجالس کو اللہ جلّ مجدہ اور حضور اکرم ﷺ کے ذکر وبیان سے خالی رکھنا۔

32 اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی بے ادبی اور توحید خالص کی ناقدری کرنا۔

33 توحید وسنت کے چمن زاروں کو ویران کرنا یا ویران کرنے کی تدابیر کرنا۔

34 اہل توحید وسنت سے مخاصمہ ومجادلہ کرنا۔

35 ارباب توحید وسنت کو پریشان وبدنام کرنا، حاملین قرآن وحدیث کے مقابلے میں اہل دُوَل اور ہوس پرستوں کو اعزاز واکرام دینا۔

36 توحید وسنت کے مراکز کو برباد کرنا یا برباد کرنے کی فکر رکھنا۔

37 شرکیہ نعتوں کو کارِ ثواب جاننا۔

38 نعتوں کو گانوں کی طرزوں اور دُھنوں پر پڑھنا۔

39 ان مذکورہ دونوں قسم (شرکیہ اور گانوں کی طرزوں پر) نعتوں کو بے تکلف مساجد یا قرآن وحدیث کی محافل میں پڑھنا اور سننا سنانا۔

40 توحید وسنت کے خلاف الیکٹرانک یا پرنٹ میڈیا پر سرگرمیاں دکھانا۔

41 جلسہ، میلاد اور نعت کی مجالس کی وجہ سے نمازوں کی ادائیگی میں سستی کا مظاہرہ کرنا۔

42 قرآن وحدیث سے ثابت شدہ جہاد کی مخالفت کرنا۔

43 اسلام دشمن قوتوں اور مستشرقین سے مرعوب ہو کر چپ سادھ لینا اور ذرا رگِ حمیت نہ پھڑکنا۔

44 مذکورہ کاموں میں سے کوئی کام ضد سے کرنا۔

45 مصنوعی درود وسلام گھڑنا اور انھیں رواج دینا۔

46 آپ ﷺ کے ذکر وبیان سے متاثر ہو کر جو شخص پُرنم ہو جائے اس عظیم آدمی سے مذاق کرنا۔

47 بیان رسول ﷺ سن کر "مصنوعی حال" پڑنا۔

48 ساز پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا نام جپنا۔

49 آپ ﷺ کا اسم گرامی سن یا پڑھ کر درود (ﷺ) نہ پڑھنا۔

50 انگوٹھے چومنے کو درود وسلام پر غالب کر دینا۔

51 نبوی اوامر ونواہی کو خاطر میں نہ لانا، بمقابلہ وحی امتیوں کے اقوال وآراء پر سرخم کرنا۔

قارئین! یہ کوئی 50 سے زیادہ رسول اللہ ﷺ کی بے ادبی کی صورتیں ممکن ہیں جن کو زیر مطالعہ رکھنا اور ان سے بچنے کی بھرپور کوشش کرنی چاہیے۔ ہر صورت کی توضیحی مثالیں دی جا سکتی ہیں، مضمون کے اختصار کے پیش نظر وضاحت نہیں کر سکے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ دوست کافی حد تک سمجھ چکے ہوں گے۔ ہم اپنی زیر تالیف کتاب ''ادب پہلا قرینہ ہے......'' [1] میں ان کی وضاحت کریں گے۔ ان شاء اللہ۔

ہمیں دوسروں کو الزام دینے کی بجائے اپنی فکر کرنی چاہیے۔ اور حبِ رسول ﷺ کے صحیح معیار پر پورا اترنے کی بھرپور کوشش کرنی چاہیے۔ اللہ کریم تمام مسلمانوں کو رسول اللہ ﷺ کے جھنڈے تلے جمع ہونے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ کیا خوب کہا مولانا ظفر علی خان علیہ الرحمہ نے ؂

جو کرنی ہے جہانگیری محمدؐ کی غلامی کر
عرب کا تاج سر پر رکھ، خداوندِ عجم ہو جا

(صلی اللہ علیہ وسلم)

دیگر انبیائے کرام علیہم السلام کا ادب [2]

نبی کریم ﷺ کے بلند و بالا اور نمایاں مقام و مرتبے کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ دوسرے انبیائے کرام علیہم السلام کی تنقیص کی جائے یا ان کے ادب و احترام میں فرق روا رکھا جائے۔ جیسے انبیائے کرام علیہم السلام میں سے کسی ایک کی تکذیب تمام انبیاء کی تکذیب کے مترادف ہے اسی طرح اللہ کے کسی بھی نبی علیہ السلام کی بے ادبی دراصل سلسلہ نبوت کی بے ادبی ہے۔

[1] مولف رحمہ اللہ کو اس پر مزید کام کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ جہاں تک کتاب کے نام کا تعلق ہے تو وہ یہی زیر نظر کتاب ہے مگر اس نام سے محترم مولانا سید ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ کی کتاب موجود تھی اس لیے اس کا نام بدل دیا گیا۔ [2] یہ ذیلی عنوان تا آخر راقم کی طرف سے اضافہ ہے۔ (محمد نعمان فاروقی)

نبی کریم ﷺ اسی سلسلہ نبوت کی آخری کڑی تھے۔ یہ سارا سلسلہ ہی انتہائی قابل احترام اوراعلیٰ مقام کا حق رکھتا ہے۔قرآن مجید میں بڑی شان سے سابقہ انبیائے کرام علیہم السلام کا تذکرہ کیا گیا ہے اسی طرح احادیث مبارکہ میں بھی نبی ﷺ نے بڑے اچھے انداز سے انبیائے کرام علیہم السلام کا ذکر فرمایا ہے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک یہودی اپنا سودا بیچ رہا تھا۔ اسے اس کے بدلے میں کسی ایسی چیز کی پیشکش کی گئی جسے اس نے ناپسند سمجھا اور کہنے لگا: نہیں! اس ذات کی قسم جس نے موسیٰ علیہ السلام کو تمام انسانوں میں سے منتخب فرمایا۔ ایک انصاری صحابی رضی اللہ عنہ نے اس کی یہ قسم سن لی، وہ اٹھے اور انھوں نے اس یہودی کو تھپڑ رسید کر دیا۔ اور ساتھ ہی کہنے لگے کہ تو کہتا ہے کہ اس ذات کی قسم جس نے موسیٰ علیہ السلام کو عالم بشریت سے چن لیا جبکہ نبی کریم ﷺ ہم میں موجود ہیں؟

وہ یہودی بارگاہِ نبوی میں پہنچا اور شکایت کرنے لگا کہ ابوالقاسم! میرا عہد و پیمان ہے اور فلاں شخص نے مجھے تھپڑ دے مارا ہے آخر کیوں؟ آپ ﷺ نے اس انصاری سے پوچھا:

((لِمَ لَطَمْتَ وَجْهَهٗ؟))

”تم نے اسے تھپڑ کیوں مارا ہے؟“

انصاری نے ماجرا سنایا تو آپ ﷺ غصے میں آگئے، حتی کہ غصہ آپ ﷺ کے چہرۂ مبارک سے عیاں ہونے لگا۔ پھر آپ نے فرمایا:

((لَا تُفَضِّلُوا بَيْنَ أَنْبِيَاءِ اللّٰهِ فَإِنَّهٗ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَيَصْعَقُ مَنْ فِي السَّمٰوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ إِلَّا مَنْ شَاءَ اللّٰهُ ثُمَّ يُنْفَخُ فِيهِ

أُخْرٰى، فَأَكُونُ أَوَّلَ مَنْ بُعِثَ فَإِذَا مُوسٰى اٰخِذٌ بِالْعَرْشِ فَلَا أَدْرِي أَحُوسِبَ بِصَعْقَتِهِ يَوْمَ الطُّورِ، أَمْ بُعِثَ قَبْلِي؟)).

''انبیاء کے مقابلے میں مجھے فضلیت نہ دیا کرو کیونکہ جب صور میں پھونکا جائے گا تو آسمان وزمین میں جو بھی ہیں وہ بے ہوش ہوجائیں گے، ان کے سوا جنھیں اللہ چاہے گا، پھر دوبارہ صور پھونکا جائے گا تو میں پہلا ہوں گا جسے اٹھایا جائے گا تو موسیٰ علیہ السلام عرش الٰہی کو تھامے ہوئے ہوں گے۔ اب مجھے یہ نہیں پتہ کہ طور پر بے ہوشی کی وجہ سے اس وقت بے ہوش نہیں ہوں گے یا مجھ سے پہلے انھیں اٹھایا جائے گا؟''[1]

نبی کریم ﷺ نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی توقیر اوراحترام ومقام کے حوالے سے تعلیم دیتے ہوئے عمومی قاعدہ بیان فرمادیا کہ اللہ کے نبیوں کے مقابلے میں مجھے فضلیت نہ دو۔

اسی طرح 10 محرم کے روزے کے حوالے سے بھی نبی کریم ﷺ نے واضح اعلان فرمایا۔ جب نبی کریم ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہاں کے یہودی 10 محرم کا روزہ رکھتے تھے۔ آپ ﷺ نے پوچھا:

((مَا هٰذَا؟)).

''یہ کس وجہ سے ہے؟''

یہود نے کہا یہ بڑا عظیم دن ہے اللہ نے اس دن سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو اور بنی اسراءیل کونجات دی تھی۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے اس دن روزہ رکھا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((نَحْنُ أَحَقُّ بِمُوسٰى مِنْكُمْ)).

[1] صحيح البخاري، حديث:3414.

”ہم تمھاری نسبت موسیٰ علیہ السلام کا زیادہ حق رکھتے ہیں۔“

لہٰذا آپ علیہ السلام نے بھی روزہ رکھا اور اس کا روزہ رکھنے کا حکم بھی دیا۔[1]

اس حدیث مبارکہ سے بہت سے احکام ثابت ہوتے ہیں مگر یہاں

((نَحْنُ أَحَقُّ)).

کے لفظ قابل غور ہیں۔ آپ علیہ السلام نے ”انا“ (میں) کے بجائے ”نَحْنُ“ (ہم) فرما کر مسلمانوں کو یہ شعور دیا کہ وہ بھی میرے ساتھ اس میں شریک ہیں، یعنی ان کی بھی سوچ یہ ہونی چاہیے کہ ہم موسیٰ علیہ السلام کے یہود سے بھی زیادہ قریبی اور ان سے بھی زیادہ حق رکھتے ہیں۔ اس لحاظ سے ہمیں سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے احترام میں ذرہ بھر بھی فرق نہیں آنے دینا چاہیے۔ یہود کی اسلام اور مسلمانوں سے عداوت اپنی جگہ مگر سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے کوئی فرق نہ آنے دیا جائے۔ ویسے بھی ہمارا عقیدہ ہے کہ

﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ﴾

”ہم اس کے رسولوں میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے۔“[2]

یعنی ایمان لانے میں اور مقام پہچاننے میں۔ باقی رہا اللہ نے رسولوں کے جو مراتب رکھے ہیں ان کا اظہار اس وقت کیا جائے جب مقابلۃً بات نہ ہو۔ کیونکہ رسولوں میں مراتب تو موجود ہیں۔ فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾

”یہ رسول ہیں ہم نے ان میں سے کئی رسولوں کو دوسروں پر فضیلت دی ہے۔“[3]

اسی طرح سیدنا عیسیٰ علیہ السلام سے تعلق کو بھی نبی ﷺ نے ہمارے سامنے رکھا، چنانچہ فرمایا:

---

[1] صحيح البخاري، حديث:2004و 3397. [2] البقرة2:285. [3] البقرة2:253.

((أَنَا أَوْلَى النَّاسِ بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ فِي الدُّنْيَا وَالآخِرَةِ وَالأَنْبِيَاءُ إِخْوَةٌ لِعَلَّاتٍ)).

''میں تمام لوگوں سے زیادہ عیسیٰ ابن مریم کے قریب تر ہوں، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اور انبیاء تو آپس میں باپ کی طرف سے بھائیوں کی طرح ہیں۔''[1]

جب نبی کریم ﷺ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام سے اپنے تعلق کا اظہار فرما رہے ہیں تو امتیوں کو بھی چاہیے کہ وہ بھی سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو مقام و مرتبہ دیں۔ نصرانی مذہب والوں نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق جو اعتقادات رکھے اور مسلمانوں سے جو بھی دشمنی کی اور کر رہے ہیں یہ سب خامیاں سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے ادب و احترام اور مقام میں حائل نہ ہونے پائیں۔ نبی کریم ﷺ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے اپنے تعلق کو بھی بڑے واضح انداز سے بیان فرمایا ہے۔ اسی طرح دیگر انبیائے کرام علیہم السلام کا ذکر خیر بھی فرمایا ہے مگر سیدنا موسیٰ اور سیدنا عیسیٰ علیہما السلام سے تعلق کا جو انداز بیان نظر آتا ہے وہ دیگر انبیاء علیہم السلام کے ساتھ نظر نہیں آتا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ مسلمانوں کا زیادہ تر مقابلہ انھی انبیائے کرام علیہما السلام پر ایمان کا دعویٰ رکھنے والوں سے تھا۔ اور مسلمانوں کو یہ سمجھا دیا گیا کہ وہ یہود کا مقابلہ کریں عیسائیوں سے محاذ آراء ہوں لیکن کبھی بھی سیدنا موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کی عزت و ناموس پر ادنیٰ سا حرف بھی نہ آنے دیں۔ واللہ اعلم

اگر مسلمان یہود و نصاریٰ کو اسلام کے قریب کرنا چاہتے ہیں تو اس سے بہتر صورت بھی کوئی نہیں کہ آپ ان کے سامنے نبی عالم ﷺ کی زبانی ان کے انبیاء کے فضائل بتائیں اور ان کا مکمل ادب و احترام کریں۔ اور انبیائے کرام علیہم السلام کے فضائل کے مابین مقابلے کی فضا نہ بنائیں۔

[1] صحيح البخاري، حديث:3443.

باب: 4

قرآنِ مجید اور سابقہ آسمانی کتابوں کا ادب

قرآنِ مجید دیگر سب کتابوں سے افضل اور اعلیٰ ہے۔ اس لیے کہ یہ اللہ احکم الحاکمین کا کلام ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات والائے صفات کا ادب اور احترام انتہائی ضروری ہے اسی طرح قرآنِ مجید کا ادب و احترام اور تعظیم بھی ضروری ہے۔ قرآنِ مجید تو اتنی عظمت والی کتاب ہے کہ جس کی نسبت اس کی طرف ہوتی ہے وہ بھی محترم اور قابل تعظیم ٹھہرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید کے ذکر کے ساتھ ہی اس کی عظمت اور تکریم کا ذکر بھی فرمایا ہے:

﴿ كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ○ فَمَنْ شَاءَ ذَكَرَهٗ ○ فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ○ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍۭ ○ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ○ كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ ○ ﴾

''ہرگز نہیں یہ تو ایک نصیحت ہے جو چاہے اس سے نصیحت لے۔ یہ قابل تعظیم صحیفوں میں ہے۔ جو بڑے بلند اور پاکیزہ ہیں اور ایسے لکھنے والے فرشتوں کے ہاتھ میں ہیں جو بڑے عزت والے اور نیکوکار ہیں۔''[1]

ایک اور مقام پر فرمایا:

[1] عبس 80:11-16.

﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ۝ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ﴾

”بلکہ یہ تو بڑی شان کا قرآن ہے۔ لوحِ محفوظ میں (لکھا ہوا) ہے۔“[1]

اس آیت میں قرآن کو ”مجید“ قرار دیا ہے۔ مجید کا مطلب ہوتا ہے مجد و بزرگی والا، قابل احترام۔

ستاروں کے گرنے کی قسم کھا کر فرمایا:

﴿اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۝ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝ لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ﴾

”بلاشبہ یہ نہایت معزز قرآن ہے۔ ایک محفوظ کتاب میں (درج) ہے۔ اسے پاک (فرشتے) ہی ہاتھ لگاتے ہیں۔“[2]

اس آیت میں قرآنِ مجید کو ”کریم“ قرار دیا گیا ہے جس کے معنی ہیں انتہائی تکریم کے لائق۔ الغرض! جب یہ کتاب دنیا کی سب کتابوں سے افضل اور اعلیٰ و بالا ہے کہ اس جیسی کوئی کتاب، سورت یا آیت نہیں ہے اور یہ ملک الملوک کا کلام ہے اور اس نے اسے قابل تعظیم و تکریم قرار دیا ہے تو ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم بھی اس کا ادب و احترام کریں۔

آدابِ تلاوت

دنیا کی کسی بھی کتاب کو پڑھنے کے آداب نہیں ہیں لیکن قرآنِ مجید ایسی کتاب ہے جس کی تلاوت کے باقاعدہ آداب ہیں۔ جو حسبِ ذیل ہیں:

① البروج 85:21-22۔ ② الواقعۃ 56:77-79.

قلبی آداب

- قرآنِ مجید کے نازل کرنے والے اللہ احکم الحاکمین کی تعظیم دل و دماغ میں جاگزیں ہو۔
- دل بھرپور متوجہ ہو۔
- تلاوت قرآن سے ایمان میں اضافہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا﴾

''اور جب ان پر اس کی آیات کی تلاوت کی جاتی ہے، تو انھیں ایمان میں بڑھا دیتی ہیں۔''[1]

- آیت کے مطابق دل پر اثرات نمودار ہوں۔
- اپنے سے متعلقہ قرآنی حکم کو اپنے لیے سمجھا جائے۔
- ایسے کاموں سے بچا جائے جو فہم قرآن کے راستے میں حائل ہوتے ہوں۔
- قرآن پڑھنے والا یہ سمجھے جیسے وہ اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہو رہا ہے۔

ظاہری آداب

1. مقدور بھر کوشش ہو کہ باوضو ہو کر تلاوت کی جائے۔
2. حالتِ جنابت میں اس کی تلاوت جائز نہیں۔ البتہ حیض و نفاس کی حالت میں چھوئے بغیر اس کی تلاوت مشروع ہے۔
3. اس کو پڑھنے سے قبل شیطان مردود سے اللہ کی پناہ میں آنا ضروری ہے۔

[1] الأنفال 8:2.

4 اسے ٹھہر ٹھہر کر مخارج کا لحاظ کرتے ہوئے پوری توجہ سے پڑھنا چاہیے۔

5 سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کرنا۔ اور قرآنِ مجید دیکھ کر پڑھنا۔ حدیث مبارکہ ہے:

((مَنْ سَرَّهُ أَنْ يُّحِبَّ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ فَلْيَقْرَأْ فِي الْمُصْحَفِ)).

''جسے پسند ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کرے تو اسے چاہیے کہ وہ قرآن مجید سے پڑھے۔''[1]

6 قرآن مجید کو کم از کم تین دن میں ختم کرنا۔ اس سے پہلے ختم کرنا جائز نہیں۔[2]

7 قرآنِ مجید کو خوش الحانی سے پڑھنا۔ ارشادِ نبوی ہے:

((لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ يَتَغَنَّ بِالْقُرْآنِ)).

''جس نے قرآن مجید کو خوش الحانی سے نہ پڑھا وہ ہمارے طریقے پر نہیں۔''[3]

8 قرآنِ مجید پڑھا جا رہا ہو تو اسے بھرپور توجہ سے سننا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوا لَهٗ﴾

''اور جب قرآن پڑھا جائے تو خوب غور سے سنو۔''[4]

9 قرآنِ مجید اس وقت تک پڑھنا جب تک دل جڑے رہیں۔ ارشادِ نبوی ہے:

((اِقْرَأُوا الْقُرْآنَ مَا ائْتَلَفَتْ قُلُوبُكُمْ فَإِذَا اخْتَلَفْتُمْ فَقُومُوا عَنْهُ)).

''اس وقت تک قرآن مجید پڑھو جب تک تمہارے دل آپس میں جڑے رہیں۔ مگر جب آپس میں اختلاف ہونے لگے تو پھر اٹھ جاؤ۔''[5]

---

[1] السلسلة الصحيحة: 341/5، حديث: 2342۔ [2] ملاحظہ کیجیے: فتح الباري، باب في كم يقرأ القرآن: 118/9۔ [3] سنن أبي داود، حديث: 1471۔ [4] الأعراف 7: 204۔ [5] صحيح البخاري، حديث: 5060.

10 اگر قرآنِ مجید کے پڑھنے میں دشواری اور اٹکن محسوس ہو تو پھر بھی پڑھنے کی کوشش کرنا۔ اس کا دوہرا اجر ہے۔ حدیث شریف میں ہے:

((وَمَثَلُ الَّذِي يَقْرَأُ الْقُرْآنَ وَهُوَ يَتَعَاهَدُهُ وَهُوَ عَلَيْهِ شَدِيدٌ فَلَهُ أَجْرَانِ)).

''اور اس شخص کی کیفیت جو قرآن کی تلاوت کرتا ہے اور اس کی پوری کوشش اور اہتمام کرتا ہے اور اسے مشقت بھی پیش آتی ہے تو اس کے لیے دوہرا اجر ہے۔''[1]

قرآنِ مجید کے ادب کی متعدد صورتیں

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''نصیحت اللہ کی کتاب کے لیے بھی ہے۔''[2] لہٰذا دوسرے حقوق کے ساتھ ساتھ اس کتابِ ذیشان کا ادب بھی اس نصیحت اور خیر خواہی میں شامل ہے۔ قرآنِ مجید کی تعظیم کی صورتیں:

- قرآنِ کریم پر ایمان لانا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے محمد ﷺ پر نازل ہوئی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ﴾

''اللہ پر، اس کے رسول پر اور اس کتاب پر ایمان لاؤ جسے اس نے اپنے رسول پر نازل کیا ہے۔''[3]

- قرآنِ مجید کی تلاوت کرنا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ﴾

---

[1] صحیح البخاري، التفسیر، سورۃ عبس، حدیث: 4937۔ [2] صحیح مسلم، الإیمان، حدیث: 55۔ [3] النسآء4:136.

''چنانچہ اس قرآن میں سے جو میسر ہو اسے پڑھو۔''[1]

- اور اس کے معانی سیکھنا اور اس کی طرف بھرپور توجہ دینا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿لِيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ﴾

''تاکہ وہ اس کی آیات پر تدبر کریں۔''

اسی طرح فرمایا:

﴿اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ﴾

''کیا تم اس قرآنِ مجید سے بے اعتنائی برتتے ہو؟''[2]

- قرآنِ مجید پر عمل کرنا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ﴾

''اور یہ ایک عظیم کتاب ہے ہم نے اسے نازل کیا ہے۔ (یہ) برکت والی ہے۔ پس تم اس کی پیروی کرو۔''[3]

یہ ادب کی سب سے بہتر صورت ہے۔ نبی کریم ﷺ کا اخلاق قرآنِ مجید کی زندہ تفسیر تھا، اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی قرآنِ مجید کو اپنا راہ نما سمجھتے تھے۔ یہ قرآن مجید کو اولیت دینے اور اس کو کتابِ زندہ سمجھنے کا عملی اعتراف ہے۔ نزولِ قرآن کا اولین مقصد یہی ہے۔

- قرآنِ مجید کو بلند اور پاک جگہ پر رکھا جائے۔ قبل ازیں قرآنی الفاظ: ﴿مَرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ﴾ گزرے ہیں جن کے معنی ہیں: ''(ایسے صحیفوں میں) جو بلند کیے گئے اور پاک صاف کیے گئے ہیں۔'' ان سے اشارہ ملتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے

[1] المزمل 73:20۔ [2] الواقعة 56:81۔ [3] الأنعام 6:155۔

بلند صحیفوں کا اہتمام کیا ہے تو ہمیں بالاولی اس کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ قرآنِ مجید سے ہم سب کو محبت ہے۔ اس محبت کے کامل حصول کے لیے ادب انتہائی ضروری ہے۔

ــ قرآنِ کریم کو یا اس کے غلاف کو میلا نہ ہونے دینا، نہ اسے پھٹنے دینا، نہ جلد اکھڑنے دینا، نہ اس پر ادھر ادھر کی باتیں لکھنا، اس کی اگرچہ کوئی شرعی دلیل نہیں مگر کوئی بھی سمجھدار انسان اپنی قابل تعظیم اور قابل احترام اور محبوب چیز کا یہ حال نہیں ہونے دیتا جو مسلمانوں کا قرآنِ مجید کے ساتھ ہے۔

قابل احترام اساتذہ کرام حفظ کی غلطیوں کو اور سبق کی حد بندی کو قرآن مجید کے اوپر ہی لگاتے ہیں۔ میرے خیال میں اس سے بچنا چاہیے۔

ــ حاملینِ قرآن، طلبائے کرام، حفاظ کرام، قرائے کرام اور علمائے عظام کو اہمیت دینا اور ان کا ادب و احترام کرنا۔ جس کتاب کی قدر و منزلت ہو تو یقیناً اس کا تقاضا یہ ہے کہ جو خوش نصیب اس کتاب کی تعلیم اور ترویج و اشاعت میں شریک ہیں ان کا احترام کیا جائے۔ دستور یہ ہے کہ ڈگری یا عہدے کے مطابق اعزاز دیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے جن کے پاس قرآن مجید کا علم ہے ان کا مقام ہمارے ہاں بلند تر ہونا چاہیے۔ ان کی قدر اور ان کا ادب و احترام درحقیقت قرآنِ کریم کا احترام ہے۔

حاملینِ قرآن کو نبی ﷺ نے یہ اعزاز بخشا کہ آپ نے انھیں امامت کا اولین مستحق قرار دیا اور فرمایا:

((يَؤُمُّكُمْ أَقْرَؤُكُمْ لِكِتَابِ اللّٰهِ)).

"تمھاری امامت وہ کرائے جو تم میں سے سب سے زیادہ پڑھنے والا ہو۔"[1]

---

[1] السنن الكبرىٰ للبيهقي: 3/125، و صحيح مسلم، حديث: 673.

شہدائے احد میں سے جسے زیادہ قرآن یاد تھا اس کو فوقیت دیتے ہوئے آپ ﷺ نے پہلے لحد میں اتارا۔[1]

اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ قرآنِ مجید کی قدر و منزلت بڑھتی ہے۔ دوسرے حاملین قرآنِ مجید میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ الگ ہے کہ آج کل یہ صورت حال بن چکی ہے۔

بدلی زمانے کی ہوا ایسا تغیر آ گیا
تھے جو گراں قیمت کبھی اب ہیں متاعِ کس مخر

لہٰذا حاملین قرآن کو بھی اپنے منصبِ جلیلہ کا خیال رکھنا چاہیے۔

- قرآنِ مجید کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ قرآنِ کریم کی زبان کا بھی ادب کیا جائے اور اسے اہمیت دی جائے۔ اور اسے زندہ رکھنے کی کوشش کی جائے چہ جائے کہ اسے نصاب سے ختم کرنے کی کوشش ہوتی رہے۔

قرآن مجید عربی زبان میں تھا اس کی وجہ سے عربی زبان بھی زندہ ہے۔ تورات اصل میں عبرانی زبان میں تھی مگر آج وہ زبان مردہ ہو چکی ہے۔ اہل تورات اس میں دوبارہ جان ڈالنے کی بھرپور کوششوں میں ہیں۔ بہر حال جس نے زمانہ طالب علمی میں عربی پڑھی ہو یقیناً اس کے لیے عمر کے کسی بھی حصے میں قرآنِ مجید کا فہم آسان ہوگا۔

- قرآنِ مجید کے اوپر کسی اور چیز حتی کہ کسی دینی کتاب کو بھی نہ رکھا جائے۔ قرآنِ مجید سب سے افضل اور اعلیٰ ہے اسے بظاہر بھی اعلیٰ و بالا نظر آنا چاہیے۔ اسی طرح قرآنِ مجید کی طرف پیٹھ کرنا یا اس کی طرف پاؤں کرنا بھی درست نہیں۔ اگرچہ اس بارے میں شرعی دلیل نہیں ہے مگر یہ ہمارے روزمرہ کے آداب معاشرت کی طرح

[1] صحيح البخاري، حديث: 1353.

ہے۔ بہت سے ایسے آداب ہوتے ہیں جنھیں ہم محض معاشرتی طور پر بجا لاتے ہیں، جبکہ ان کی کوئی شرعی دلیل نہیں ہوتی جیسے یہ کسی حدیث میں نہیں آیا کہ والدین یا اساتذہ کی طرف پاؤں نہ کریں، یہ کہیں نہیں آیا کہ بزرگوں سے بلند جگہ پر نہ بیٹھا جائے، اس طرح یہ بھی منقول نہیں ہے کہ چارپائی کی پائنتی کی جانب کوئی بزرگ تر شخصیت نہ بیٹھے مگر ہم اس قسم کے آداب کا خیال رکھتے ہیں، لہٰذا ہمیں ممکن حد تک اس مقدس کتاب کا بھی احترام کرنا چاہیے۔

قرآن مجید کی تعظیم سے متعلقہ چند سوالات و جوابات

سوال قرآن مجید کے لیے ''قیمت'' کا لفظ بولنا کیسا ہے؟

جواب قرآن مجید اگر بازار سے لینا ہو تو اس کے لیے ''قیمت'' کے بجائے ''ہدیہ'' کا لفظ ادباً استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ مسلمانوں کے ہاں ایک اچھا طریق رائج ہے۔ اور اس کے دلی احترام کی ایک صورت ہے مگر یہ ضروری نہیں ہے۔

سوال قرآن مجید کے لیے ''شہید'' کا لفظ؟

جواب قرآن مجید کی خستہ حالت ہونے پر اس کے ادب کی خاطر شہید اوراق کہنا چاہیے یا ایسے بھی کہہ سکتے ہیں کہ صفحات پھٹ گئے یا اگر دشمن کی طرف سے قرآن مجید کی ہرزہ سرائی کی گئی ہو تو اسے کیسے تعبیر کرنا چاہیے ''جلا دیا'' یا ''شہید'' کر دیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ شہید کا لفظ اللہ کے راستے میں جان قربان کرنے والے کے لیے بولا جاتا ہے۔ قرآن کی اس طرح کی حالت ہو جانا اور ''شہادت'' میں بہت بڑا فرق ہے۔ ویسے بھی سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے جب ایک قرآن مجید پر امت کو جمع کیا تو اس کے سوا جتنے نسخے تھے ان کے متعلق بخاری شریف میں ہے:

((وَأَمَرَ بِمَا سِوَاهُ مِنَ الْقُرْآنِ فِي كُلِّ صَحِيفَةٍ أَوْ مُصْحَفٍ أَنْ يُّحَرَّقَ)).

”اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کے سوا جتنے نسخے تھے، خواہ وہ صفحات کی شکل میں تھے یا قرآن کی صورت میں سب کو جلانے کا حکم دیا۔“[1]

ہر چند یہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی تعبیر نہیں ہے مگر اس امت کے سلف صالحین کے الفاظ ہیں، حالانکہ شہادت کا لفظ بھی موجود تھا۔

سوال قرآن مجید کے شہید/ پھٹے ہوئے اوراق کا کیا کیا جائے؟

جواب قرآن مجید کا ایک لفظ ہو یا سطر اسی طرح قرآن مجید جس بھی حالت میں ہو.......... ہے تو وہ اللہ کی کتاب، لہٰذا اس کے ساتھ عام کتابوں کا سا معاملہ نہیں کرنا چاہیے۔

اس کی حفاظت، جلد کا خیال اور پھٹنے اور اوپر کچھ لکھنے سے تحفظ ہونا چاہیے، پھر بھی اگر ایسا ہو جائے تو ان اوراق کو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے مذکورہ فرمان کی روشنی میں جلایا جا سکتا ہے۔ اگرچہ اس کی راکھ کا بھی ادب ہونا چاہیے تاکہ اس کی بھی توہین نہ ہو۔ علاوہ ازیں انھیں کسی ایسی جگہ دفن بھی کیا جا سکتا ہے جہاں گزر گاہ نہ ہو۔ اب تو مقدس اوراق کو اہانت سے بچانے کے لیے متعدد تحریکیں اور ادارے کام کر رہے ہیں، ان کے حوالے کر دینا چاہیے۔ یا کسی مسجد میں رکھوا دینا چاہیے تاکہ اعلیٰ سطح پر اس کا مناسب انتظام ہو سکے۔

حکومت پنجاب نے اس کا باقاعدہ اہتمام کیا ہے۔ پورے پنجاب میں نیٹ ورک ہے۔ ضرورت پڑنے پر رابطہ کیا جا سکتا ہے۔

پنجاب قرآن بورڈ، اپر مال سکیم، لاہور۔

ایڈمنسٹریٹر آفیسر: 042-99237088

0300-4516105

0345-4747471

---

[1] صحیح البخاري، حدیث:4987.

سوال قرآن مجید گر پڑے تو کیا کیا جائے؟

جواب قرآن مجید کے ادب کے حوالے سے یہ سوال بھی بڑا ضروری ہے کہ اگر قرآن مجید گر پڑے تو کیا کیا جائے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسے فوراً اٹھا لیا جائے اور بلند جگہ پر رکھا جائے۔ اس حوالے سے کوئی کفارہ نہیں ہے۔ جان بوجھ کر تو کوئی مسلمان ایسا سوچ بھی نہیں سکتا بس انجانے ہی میں ایسا ہو سکتا ہے۔ اس لیے بھولے سے یا غلطی سے کچھ ہو جانے پر استغفار ہی کیا جا سکتا ہے۔

البتہ احتیاط ہمارے ذمے ہے۔ خصوصاً کسی تعلیمی ادارے یا مساجد میں چھٹی کے وقت جب طلبہ یا طالبات قرآن مجید الماریوں میں رکھتے ہیں تو جلد بازی اور دھکم پیل کی وجہ سے ایسا ہونے کے خدشات بڑھ جاتے ہیں۔ اساتذہ کرام کو چاہیے کہ وہ اس سلسلے میں کوئی ضابطہ مقرر کر دیں کہ پہلے اس لائن کے بچے قرآن مجید رکھ لیں پھر دوسری لائن کے۔ اس کے ساتھ ساتھ زیادہ الماریوں کا اہتمام بھی کیا جا سکتا ہے۔

اس موقع پر قرآن مجید کو چوما بھی جاتا ہے۔ یہ ایک فطری تقاضا ہے اس سے ممانعت کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ فطری تقاضا اس لیے لکھا ہے کہ آپ کسی شخص کی بے ادبی کر بیٹھیں تو آپ اسے خوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ کو اس پر پیار آتا ہے۔ چھوٹا ہو تو اسے راضی کرنے کے لیے چومتے بھی ہیں۔

سوال پڑھتے پڑھتے قرآن مجید کھلا چھوڑا جا سکتا ہے؟

جواب کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دوران تلاوت اچانک کوئی کام پڑ جاتا ہے۔ اور قرآن مجید جلدی کی وجہ سے یا وقت بچانے کی وجہ سے کھلا رہنے دیا جاتا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ کھلا نہیں چھوڑنا چاہیے کیونکہ شیطان پڑھنے لگ جاتا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ شیطان تو قرآن مجید اور اس کی مجلس سے دور بھاگتا ہے۔ قرآن کریم کا اکثر حصہ تو اس

کی اور اس کے کارندوں کی مخالفت بلکہ عداوت کی بابت ہے۔ وہ تو بندوں کو نہیں پڑھنے دیتا، اس نے کیوں پڑھنا ہے!! ہاں البتہ قرآن مجید کھلا رہنے کی صورت میں حشرات الارض وغیرہ اس سے گزر سکتے ہیں یا اس پر بیٹھ سکتے ہیں۔ ہوا چل رہی ہو تو صفحے ادھر ادھر اڑتے رہیں گے علاوہ ازیں بے ادبی کے اور بھی کئی پہلو ہو سکتے ہیں۔ اس لیے بند کرنا ہی بہتر ہے۔ اگر اچانک اٹھنا پڑ جائے تو بس صفحہ نمبر ذہن میں رکھ لیں اور بند کر دیں۔

قرآنِ مجید کے سوءِ ادب کی چند صورتیں

- قرآنِ مجید نہ پڑھنا، نہ پڑھنے کی کوشش کرنا، جبکہ اپنی معاشی ضروریات کے لیے سرتوڑ کوشش کرنا۔ قرآنی تعلیم و تعلم کی طرف مطلق توجہ نہ ہونا۔ دیکھا جائے تو بہت سے مسلمان عالم شباب کو پار کر کے عالم پیری میں پہنچ چکے ہیں مگر قرآنِ مجید پڑھنا ہی نہیں جانتے۔ اس کو سمجھنا یا اس پر عمل کرنا تو دور کی بات۔ ایسے لوگوں کو اپنی اس غفلت والی روش سے اجتناب کرنا چاہیے مبادا یہ لوگ اس ارشاد کے مصداق بن جائیں:

﴿وَقَالَ الرَّسُولُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُورًا﴾

”اور (روز قیامت) رسول اللہ ﷺ کہیں گے: اے میرے رب! بے شک میری قوم نے قرآنِ مجید کو چھوڑ رکھا تھا۔“[1]

- جو لوگ قرآنِ مجید پڑھنا جانتے ہیں اور اسے سمجھنے کی استعداد رکھتے ہیں وہ اس سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے تاویل کرنے لگ جاتے ہیں۔ یہ قرآنِ مجید کی بہت بڑی توہین ہے کہ بندہ پہلے ایک ذہن بنا لے پھر قرآنی آیات کا مفہوم بدل کر اسے

[1] الفرقان 30:25.

اپنے مسلک یا موقف کی تائید میں پیش کرتا پھرے۔قرآنِ مجید کو اپنا قائد بنا کر اس کے پیچھے چلنا چاہیے۔ ارشادِ نبوی ہے:

((مَنْ جَعَلَهُ إِمَامَهُ قَادَهُ إِلَى الْجَنَّةِ. وَمَنْ جَعَلَهُ خَلْفَ ظَهْرِهِ سَاقَهُ إِلَى النَّارِ)).

''جس نے قرآن مجید کو اپنا قائد بنا لیا قرآنِ مجید اسے جنت کی طرف لے جاتا ہے اور جو اسے پسِ پشت ڈالتا ہے یہ اسے جہنم کی طرف ہانکتا ہے۔''[1]

اقبال کی زبان میں اسے یوں سمجھیں ؎

خود بدلتے نہیں، قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

ہر گمراہ فرقے نے قرآنِ مجید کے مفاہیم بگاڑ کر ہی اپنا اُلو سیدھا کیا ہوا ہے۔

- قرآنِ مجید کی متشابہ آیات کے پیچھے لگنا۔ یہ دلوں کے ٹیڑھ پن کی علامت ہے۔
- قرآنِ مجید کو نعوذ باللہ فرسودہ کتاب یا دقیانوسی نظام قرار دینا۔ غیر مسلموں نے اسلام کے خلاف جو زہر اگلا ہے اس کا اثر نام نہاد مسلمانوں پر بھی پڑا ہے اور وہ اپنی زبانوں سے ان کی فکر کا اظہار کرنے لگے ہیں۔ یہ قرآنِ مجید کی بہت بڑی بے ادبی ہے کہ اسے تمام ادوار کے تقاضوں سے ہم آہنگ قرار نہ دیا جائے کیونکہ یہ کتابِ زندہ قیامت تک کے لیے ہے۔

آں کتاب زندہ قرآن کریم
حکمتِ او لا یزال است و قدیم

[1] صحیح ابن حبان، حدیث:1793.

لہٰذا کوئی بھی دور ہو اور کوئی بھی فیلڈ ہو اس میں یہ کتاب راہ نمائی فراہم کرتی ہے بلکہ سب سے سیدھی راہ پر گامزن کرتی ہے۔ خود قرآن مجید میں ہے:

﴿إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ﴾

''یہ قرآن اس راستے کی طرف راہ نمائی کرتا ہے جو سب سے سیدھا ہے۔''[1]

یہ ہماری کمزوری ہے کہ ہم اس میں غوطہ زن نہ ہوں۔

- قرآنِ کریم کی تحریف کرنا۔ جب بات تاویل سے نہیں بنتی تو اپنے خود ساختہ موقف کی تائید کے لیے تحریف کا سہارا بھی لینا پڑتا ہے۔ اور نام نہاد مسلمان اس سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ بلکہ کئی بدنصیب قرآنِ مجید کو تحریف شدہ مانتے ہیں۔ اور اس بارے میں باقاعدہ کتابیں لکھی ہوئی ہیں۔ اور اس موقف کے اظہار سے وہ مستشرقین اور اسلام دشمن عناصر کو سپورٹ دے رہے ہیں۔
- قرآنِ مجید کی تفسیر اور توضیح کے لیے احادیث کے مقابلے میں لغت اور ادب کو ترجیح دینا یا سرے سے حدیث کو تسلیم ہی نہ کرنا۔ یہ قرآن مجید کی بھی توہین ہے اور رسول اللہ ﷺ کی بھی توہین ہے۔ اس سلسلے میں شیخ القرآن مولانا عبدالسلام رستمی رحمہ اللہ کی کتاب ''انکارِ حدیث سے انکارِ قرآن تک'' بڑی عمدہ کاوش ہے۔

قرآنِ مجید کی مخالفت کرنا۔ اس ضمن میں دو طبقات ہیں: ایک وہ جو جہالت کی بنیاد پر ایسا کرتے ہیں۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جو تاویل، تحریف وغیرہ نہیں کر پاتا مگر سرِ عام قرآنِ مجید کی مخالفت کرتا ہے۔ پہلے طبقے کے متعلق وعید پڑھ چکے ہیں جبکہ دوسرے طبقے کے لیے بھی بڑی وعید ہے:

[1] بني إسرآئيل 17:9.

﴿وَ مَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ﴾

''اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی مخالفت کرتا ہے تو یقیناً اللہ سخت انجام والا ہے۔''[1]

قرآن مجید کے مفہوم کو بدلنا یا اس کی مخالفت کرنا کس قدر شدید جرم ہے!! آیئے جائزہ لیں۔

طلاق کے مسئلے کی وضاحت کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا تھا:

((أَيُلْعَبُ بِكِتَابِ اللّٰهِ وَأَنَا بَيْنَ أَظْهُرِكُمْ؟))

''کیا کتاب اللہ کو بازیچۂ اطفال بنا رکھا ہے، حالانکہ میں تم میں موجود ہوں۔''[2]

کس قدر شدید ریمارکس ہیں!! مگر یہ اسی پر اثر کرتے ہیں جو مقام رسالت علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے آشنا ہو۔

اس ضمن میں وہ لوگ بھی آتے ہیں جو دنیاوی مقاصد کی خاطر آیات کو بیچ ڈالتے ہیں۔ کبھی فتوی قرآن وسنت کے منافی دے دیا اور کبھی مسئلہ غلط بتا دیا۔ یہ بھی قرآن و سنت کی توہین کا ایک سنگین پہلو ہے۔

ــ قرآنِ مجید کی آیات کو عاجز کرنے کی کوشش میں رہنا۔ اس میں اکثر ایسے لوگ گرفتار ہوتے ہیں جو جدید علوم خصوصاً سائنس کو ایک مسلمان کی نظر سے نہیں بلکہ ایک مطلق محقق کی نظر سے پڑھتے ہیں۔ وہ قرآنِ مجید کی آیات یا اس سے مستنبط احکام کو عقل اور سائنس پر تول کر تصدیق کرتے ہیں۔ تصدیق ہو جائے تو مان لیتے ہیں ورنہ یہ ضروری نہیں کہ وہ اسے مان لیں۔ بہت سے لوگ شک میں گرفتار ہو جاتے ہیں، حالانکہ اللہ نے اپنی حکمت

[1] الأنفال8:13۔ [2] سنن النسائي، حديث:3430.

کے تحت اس کتاب کے شروع ہی میں فرما دیا:

﴿لَا رَيْبَ فِيهِ﴾

''اس میں کوئی شک نہیں۔''

ـــ قرآنِ مجید کو غیر ثابت شدہ مواقع پر پڑھنا جیسا کہ یہ کتاب زندوں کی تھی مگر اسے مردوں کے لیے خاص کر دیا گیا حتی کہ اسے قبرستان میں پڑھا جانے لگا، حالانکہ آپ ﷺ کا واضح فرمان ہے:

((لَا تَجْعَلُوا بُيُوتَكُمْ مَقَابِرَ)).

''اپنے گھروں کو (قرآن کی تلاوت کے بغیر) قبرستان نہ بناؤ۔''[1]

علامہ البانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''اس حدیث میں اشارہ ہے کہ قبرستان شرعاً تلاوت قرآن کی جگہ نہیں ہے۔''[2]

اسی طرح پڑھے پڑھائے قرآنِ مجید مدارس و مساجد میں فروخت ہونے لگے......۔

ـــ قرآنِ مجید کی آیات کو ہندسوں کی شکل میں لکھنا۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اگر ہم 786 کی جگہ بسم اللہ لکھیں تو اس سے بسم اللہ کی توہین ہو سکتی ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ قرآن جس زبان میں نازل ہوا اس میں توہین ہوتی ہے مگر ہندسوں کی شکل میں توہین نہیں ہوتی؟ نبی کریم ﷺ نے غیر مسلم حکام کو خطوط ارسال کیے تو ان میں ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' بھی لکھوائی۔ ان میں سے ایک نامہ مبارک جو آپ ﷺ نے شاہِ روم ہرقل کو لکھا اس کے آغاز میں بھی بسم اللہ لکھوائی۔[3]

---

[1] صحيح مسلم، حديث: 780۔ [2] تلخيص أحكام الجنائز، ص: 82۔ [3] صحيح البخاري، حديث: 7.

اسی طرح سیدنا سلیمان علیہ السلام نے ملکۂ سبا کو خط بھیجا تو اس کے آغاز میں بھی بسم اللہ لکھی گئی جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بھی کیا ہے۔[1] یہاں بسم اللہ کی بے ادبی کا امکان بھی زیادہ تھا کیونکہ وہ کافر تھے اور حضرات انبیائے کرام علیہم السلام بہت زیادہ محتاط بھی تھے۔ مگر انھوں نے بھی ایسا کوئی اسلوب اختیار نہیں کیا۔

دوسرے اگر 786 بسم اللہ کا متبادل ہے تو 786 کا وہی مطلب ہے جو بسم اللہ کا۔ اس طرح ان کے نزدیک دونوں کا مقصد جب ایک ہے تو حکم بھی ایک ہونا چاہیے۔

تیسرے یہ کہ کہا جاتا ہے کہ ہندوؤں کی دیوی ''ہری کرشنا'' کے ہندسے بھی علم الاعداد کی روشنی میں 786 بنتے ہیں۔ لہٰذا مسلمانوں کو احتیاط کرنی چاہیے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے اسمائے گرامی، اس کے رسول کے نام اور قرآن مجید کے الفاظ کا ادب کرتے مگر ہم نے ان میں ایک عجیب تبدیلی شروع کر دی۔ ایسے کرنے والے اپنے نام کے ساتھ ساتھ ہندسے پسند کریں گے؟ مثلاً کسی کا نام ''عرفان الٰہی'' ہے تو وہ یہ پسند کرے گا کہ اسے 335 کہا جائے۔ اور اسی طرح کسی کو 420۔ قرآنی آیات یا اللہ تعالیٰ کے اسمائے گرامی کو ہندسوں کی شکل میں لکھنے والے حسب ذیل آیت پر غور کریں تو ان پر واضح ہو جائے گا کہ یہ جرم معمولی نوعیت کا نہیں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلِلّٰهِ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا وَ ذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْ اَسْمَائِهٖ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾

''اور اللہ ہی کے لیے ہیں اچھے سے اچھے نام، لہٰذا اسے انھی ناموں سے پکارو اور جو اس کے اسمائے مبارکہ کے بارے میں سیدھے راستے سے ہٹتے ہیں،

① النمل 30:27.

انھیں چھوڑ دو، انھیں عنقریب اس کا بدلہ دیا جائے گا جو وہ کیا کرتے تھے۔''[1]

اس کی ایک ادنیٰ سی صورت یہ بھی ہے جو ہم اپنے ناموں کی تخفیف کی صورت میں کرتے ہیں۔ والدین نے شوق سے نام ''اللہ دتہ'' رکھا مگر یہ اسے چھپانے کے لیے اے۔ ڈی بننے میں لگا رہتا ہے، والدین نے نام کے ساتھ عزت و شرف کے لیے ''محمد'' لگایا مگر یہ ''ایم'' یا ''M'' لکھ لیتا ہے اور کہتا ہے اتنا لمبا نام کون لکھے!! غرضیکہ ہندسوں کی شکل میں لکھنا بہت بڑی گمراہی، بدعت اور الحاد ہے۔

- قرآن مجید کی ناقص کاغذ پر ناقص طباعت کرنا۔ مسلمانوں کی طرف سے ایک یہ بھی اہانت کا انداز ہے۔ آپ حیران ہوں گے کہ اٹلی کے ایک پریس نے سب سے مہنگی کتاب بائبل پرنٹ کی۔ جس کے ایک نسخے کی قیمت 10 ہزار ڈالر تھی۔ یہ اغیار کا اپنی الہامی کتب کے ساتھ معاملہ ہے۔ وہ اپنی تحریف شدہ کتابوں کی اتنی قدر کرتے ہیں اور مسلمان اسے اخباری کاغذ پر چھپواتے نظر آتے ہیں، کوئی لفظ پڑھا جاتا ہے کوئی نہیں۔ علاوہ ازیں مس پرنٹنگ کا خیال تک نہیں رکھا جاتا۔ بائنڈنگ کا بھی کوئی خاص معیار نہیں۔ تبھی تو مساجد میں رکھے ہوئے بہت سے قرآن مجید جلد ہی اپنی اصلی حالت میں نظر نہیں آتے۔ طباعتی اداروں نے اس لیے یہ معیار گرا لیا ہے کہ گاہک کم سے کم ہدیہ چاہتا ہے۔ یا پھر سرے سے اس کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ اسی طرح جب قرآنِ مجید کے اوراق بوسیدہ ہو جاتے ہیں اسی حالت میں قرآن مجید پڑے رہتے ہیں کوئی یہ زحمت نہیں کرتا کہ انھیں اٹھوا کر نئے قرآنِ مجید لا کر رکھے۔
- قرآنِ مجید کی بے ادبی کا یہ بھی ایک انداز ہے کہ ٹیلی ویژن، ریڈیو اور دیگر ذرائع ابلاغ میں پہلے پہل تلاوت نشر ہو بعد ازاں انھی جگہوں سے گانے اور فلمیں نشر ہوں۔

[1] الأعراف 180:7.

کیا آپ پسند کریں گے کہ جس برتن میں حلال اشیاء کھاتے پیتے ہیں ان میں حرام اور وہ بھی پلید چیزیں استعمال کریں؟ تو پھر قرآنِ مجید کے ساتھ یہ برتاؤ کیوں؟

وہی سکرین جس پر کچھ دیر پہلے قرآن مجید اور اس کا ترجمہ دیکھ رہے تھے تھوڑی دیر بعد ہی اس پر عریاں تصاویر دیکھنی شروع کریں۔ میڈیا کو اس کا خیال رکھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ ہر طرف سے ''آزاد'' ہے مگر مسلم گھرانوں کو کم از کم اس کے متعلق سوچنا چاہیے۔

حسی اور معنوی پلیدی کا فرق ایک طرف لیکن پاکی اور پلیدی میں واضح فرق ضروری ہے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ گھر میں دو سی ڈی پلیئر یا دو T.V رکھ لیے جائیں بلکہ یہ مطلب ہے کہ حرام اور ناجائز امور کو دیکھا ہی نہ جائے۔

اسی طرح پرنٹ میڈیا کا مسئلہ ہے۔ وہاں بھی قرآنِ مجید کی آیات لکھی ہوتی ہیں یا ترجمہ اور دوسری طرف بے ہودہ نیم عریاں تصاویر۔ بسا اوقات کاغذ دوہرا کرنے پر قرآنی الفاظ اور ایسی بے ہودہ تصاویر آپس میں مل جاتے ہیں۔

- قرآنِ مجید کو عام لوگوں کے لیے مشکل قرار دے کر یہ نظریہ عام کرنا کہ یہ عام بندوں کو سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ اسے سمجھنے کے لیے پہلے 14 علوم پڑھنے چاہئیں، پھر سمجھ میں آئے گا۔ اس بارے میں عرض ہے کہ جنھوں نے قرآن مجید کا ترجمہ یا تفسیر اپنی زبان میں لکھی ہے انھوں نے 14 علوم پڑھے ہی ہیں، وہ تو انھیں پڑھنے دیں۔ خود سیکھنے اور پڑھنے پر ابھارنے کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ہر کوئی قرآنِ مجید کا من بھاتا مفہوم سمجھتا پھرے۔

- قرآنِ مجید کی تلاوت ہو رہی ہو اور لوگ اپنی باتوں یا کاموں میں اس طرح مگن ہوں کہ اسے سن یا سمجھ نہ رہے ہوں بلکہ شور و شغب میں مشغول ہوں۔

- قرآنِ مجید کا ورق الٹنے کے لیے تھوک لگانا۔
- جماہی کے دوران بھی تلاوت جاری رکھنا۔
- ہاتھوں کو پاؤں یا دیگر ایسی جگہوں پر لگا کر قرآنِ مجید پر لگا لینا۔ حفظ قرآن کی سعادت حاصل کرنے والے عموماً اس کا خیال نہیں رکھتے۔
- بائیں ہاتھ یا اس کی انگلی کو قرآنِ مجید پر رکھنا۔

ممنوعات

- نبی کریم ﷺ نے قرآنِ مجید کو کفار کی سرزمین میں لے جانے سے منع فرمایا ہے۔

حدیث ہے:

((أَنَّهُ كَانَ يَنْهٰى ﷺ أَنْ يُّسَافَرَ بِالْقُرْآنِ إِلٰى أَرْضِ الْعَدُوِّ، مَخَافَةَ أَنْ يَّنَالَهُ الْعَدُوُّ)).

''نبی کریم ﷺ قرآن مجید کو دشمن کی سرزمین میں ساتھ لے جانے کی ممانعت فرماتے تھے، کہیں دشمن اس کی بے ادبی نہ کرے۔''[1]

اس ممانعت کے اس کے علاوہ بھی کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔

- آپ ﷺ نے رکوع اور سجدے میں بھی قرآن مجید کی تلاوت سے منع فرمایا ہے۔
- آپ دنیا جہان کی کوئی چیز بھول جاتے ہیں تو آپ پر کوئی قدغن نہیں کہ آپ یہ کہیں کہ میں بھول گیا ہوں مگر قرآن مجید کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ اگر کوئی شخص قرآن مجید یا اس کا کچھ حصہ بھول گیا ہو تو اسے یہ نہیں کہنا چاہیے کہ میں بھول گیا ہوں بلکہ یہ کہنا

[1] صحيح مسلم، الإمارة، باب النهي أن يسافر ... حديث: 1869.

چاہیے مجھے بھلا دیا گیا ہے۔ حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((بِئْسَ مَا لِأَحَدِهِمْ يَقُولُ نَسِيتُ آيَةَ كَيْتَ وَكَيْتَ بَلْ هُوَ نُسِّيَ)).

''لوگوں میں سے کسی ایک کے لیے یہ کتنا نامناسب ہے کہ وہ کہے کہ فلاں اور فلاں آیت میں بھول گیا ہوں بلکہ وہ بھلا دیا گیا ہے۔''[1]

مشروعات (جائز امور)

- قرآن مجید کی تعلیم و تدریس کے سلسلے میں اجرت لینا۔
- دورانِ تلاوت سلام کا جواب دینا۔
- چھینک لینے والے کا جواب دینا۔
- اذان کا جواب دینا۔
- اسی طرح قرآنِ مجید کی قسم کھانا بھی جائز ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور کلام صفت ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفات کی قسم کھائی جاسکتی ہے۔

سابقہ کتب سماویہ کا ادب و احترام

اس میں کوئی شک نہیں کہ سابقہ کتب سماویہ تحریف شدہ ہیں۔ اپنی اصلی حالت پر نہیں ہیں۔ مگر کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ ان کا احترام نہ کیا جائے، ان کی تصدیق نہ کی جائے۔ ان پر ایمان نہ رکھا جائے!! اس کا جواب یہ ہے کہ ان تحریف شدہ کتابوں کا بھی ادب کرنا چاہیے۔ عہدِ نبوی میں یہ اپنی اصلی حالت پر نہیں تھیں، اسی لیے تو قرآن مجید میں بھی یہود کی تحریف کا ذکر ہے۔ اس کے باوجود نبی ﷺ نے ان کتب سے احترام

[1] صحيح البخاري، حديث:5039.

کا معاملہ کیا۔ زنا کے ایک کیس کے فیصلے کے لیے یہود آپ ﷺ کو دعوت دینے کے لیے آپ کی خدمت میں آئے۔ آپ ان کے عبادت خانے بیت المدراس میں چلے گئے۔ یہود نے عرض کیا: ہمارے ایک آدمی نے کسی عورت سے زنا کیا ہے، لہٰذا آپ ان دونوں کا فیصلہ کریں۔ یہود نے آپ ﷺ کے لیے ایک بڑا سا تکیہ رکھوایا ہوا تھا، آپ اس پر تشریف فرما ہوئے۔ بعد ازاں فرمایا:

((إِئْتُونِي بِالتَّوْرَاةِ)).

''میرے پاس تورات لاؤ۔''

تورات لائی گئی تو آپ ﷺ نے اپنے نیچے سے تکیہ کھینچا اور تورات کو اس پر رکھا، پھر فرمایا:

((اٰمَنْتُ بِكِ وَبِمَنْ أَنْزَلَكِ)).

''میں تجھ پر بھی اور تجھے اتارنے والے پر بھی ایمان رکھتا ہوں۔''[1]

نبی کریم ﷺ نے تحریف شدہ تورات کی تعظیم کی اور ہمیں یہ درس دیا کہ ان کتابوں سے تمھارا معاملہ بھی ایسا ہونا چاہیے۔ اور جب تورات اور سابقہ دیگر کتب سماوی سے یہ معاملہ ہے تو پھر قرآن مجید کا تو بالاولی ادب واحترام کرنا چاہیے۔ عرب لوگ اس میں احتیاط نہیں کرتے اور قرآن مجید کو نیچے ہی رکھ دیتے ہیں۔ یہ تعلیمات نبویہ کے عین منافی ہے، خواہ ان کے پاس جواز کے سو دلائل ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو اپنے پاس رکھنے کے لیے بھی بلند جگہ کا انتخاب فرمایا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿فِي صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۝ مَّرْفُوعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ﴾

[1] سنن أبي داود، الحدود، باب رجم اليهوديين، حديث:4449.

''یہ (قرآن) عزت دیے گئے صحیفوں میں سے ہے جو بلند اور پاکیزہ ہیں۔'' [1]

جب اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کو یہ اعزاز بخشا ہے تو ہمیں بھی اس کا پاس کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو قرآنِ مجید اور سابقہ کتب سماویہ کا احترام کرنے کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین

[1] عبس 80:13-14.

باب: 5

احادیث مبارکہ کا ادب

احادیث مبارکہ بھی وحی ہیں

حدیث پاک بھی دراصل اللہ کی طرف سے وحی ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی ○ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی﴾

''آپ (ﷺ اپنی) خواہش سے نہیں بولتے۔ وہ وحی ہی تو ہے جو (آپ ﷺ کی طرف) بھیجی جاتی ہے۔''[1]

قرآن مجید اور حدیث پاک میں فرق یہ ہے کہ قرآنِ مجید کے الفاظ بھی توقیفی اور منجانب اللہ ہوتے ہیں اور انھیں پڑھنا بھی ثواب ہے مگر حدیث میں حکم اللہ کا ہوتا ہے اور الفاظ نبی ﷺ کے ہوتے ہیں اور قرآنِ مجید کی طرح اس کے ایک ایک حرف پڑھنے پر نیکیاں نہیں ملتیں۔ ویسے عام نیکیوں کی طرح حدیث پڑھنے کا ثواب اپنی جگہ موجود ہے۔ اور موقع محل کے مطابق اور نیت اور جذبے کے حساب سے اس میں بے پایاں اضافہ بھی ہوجاتا ہے۔

قرآنِ مجید کی طرح احادیثِ مصطفیٰ ﷺ کا ادب بھی ضروری ہے۔ یہ تمام انسانوں میں سے بہترین اور افضل ترین ہستی کی زبان مبارک سے جاری ہونے والے الفاظ

[1] النجم 53:3-4.

ہیں۔ ان کی اہمیت اس قدر ہے کہ زبان نبوت سے نکلے اور ہمارے لیے دین بن گئے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

((مَا مِنَ الْأَنْبِيَاءِ نَبِيٌّ إِلَّا أُعْطِيَ مِنَ الْآيَاتِ مَا مِثْلُهُ آمَنَ عَلَيْهِ الْبَشَرُ وَإِنَّمَا كَانَ الَّذِي أُوتِيتُهُ وَحْيًا أَوْحَاهُ اللّٰهُ إِلَيَّ فَأَرْجُو أَنْ أَكُونَ أَكْثَرَهُمْ تَابِعًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ)).

''سابقہ تمام انبیائے کرام علیہم السلام کو ایسے معجزات سے نوازا گیا جن کی بدولت لوگ ایمان لے آتے تھے۔ یقیناً مجھے بھی وحی کی صورت میں یہ معجزہ عطا کیا گیا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے مجھ پر وحی کیا ہے، چنانچہ مجھے اُمید ہے روز قیامت میرے پیروکاروں کی تعداد دوسرے انبیائے کرام علیہم السلام کے متبعین سے زیادہ ہوگی۔''[1]

الغرض! جیسے آپ ﷺ کی ذات تمام انسانوں میں سے افضل ہے اسی طرح آپ ﷺ کی ''بات'' (حدیث) بھی تمام انسانوں کی بات سے بہتر اور افضل ہے۔

حدیث پاک کی اس قدر اہمیت ہے کہ اس کے لیے اصولِ حدیث کا فن وجود میں آیا اور روایت کرنے والوں کے حالاتِ زندگی اور اساتذہ کرام سے ملاقاتوں کے سلسلے اور علمی سفر قلمبند ہوئے۔ روئے زمین پر یہ یگانہ اعزاز صرف اور صرف حدیثِ مصطفیٰ ﷺ کو حاصل ہے۔ حدیث کی اسی اہمیت، حیثیت اور مقام کے پیش نظر اس کا ادب واحترام از حد ضروری ہے۔

[1] صحيح البخاري، حديث:4981.

حدیث مبارکہ کے ادب کی قابلِ ذکر صورتیں

1 احادیثِ رسول ﷺ کو احادیثِ رسول سمجھنا

امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری شریف میں سب سے پہلے بدء الوحی کا باب قائم کر کے یہ بتایا ہے کہ جو شخص یہ تسلیم کرے گا کہ رسول اللہ ﷺ پر وحی اترتی تھی اور اسے محفوظ کیا جاتا رہا، اس کے لیے اس کتاب میں آنے والی ساری تعلیمات بھی قابلِ توجہ اور قابلِ عمل ہوں گی۔ اور جس کا یہ یقین نہیں ہوگا اس پر یہ کچھ اثر انداز نہیں ہوں گی۔

اسلام دشمن طاقتوں نے پہلے مسلک اعتزال کی صورت میں، پھر مستشرقین کی صورت میں بہت کام کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ حدیثِ رسول ﷺ سے خود مسلمانوں کا اعتبار اٹھ جائے۔ دوسرے حربوں کی طرح وہ اس میں بھی کسی حد تک کامیاب ہوئے اور انھیں منکرینِ حدیث، اہل قرآن، پرویزی اور غامدی کے ناموں سے ہر دور میں اپنے ہمنوا ملتے گئے۔ ان لوگوں نے اسلام کے لیے کوئی کارہائے نمایاں انجام تو نہ دیے مگر ایک خاص طبقے کے مسلمانوں کو حدیث کے بارے میں شکوک وشبہات کا شکار کر دیا۔ اب یہ طبقہ یا ان سے متاثر طبقہ یہ ماننے کے لیے تیار ہی نہیں کہ یہ احادیث واقعی رسول اللہ ﷺ کی احادیث ہیں۔ اور وہ حدیث مبارکہ کی سکہ بند متفق علیہ کتابوں کو بھی مذہبی داستانیں اور افسانے قرار دیتے ہیں۔ ان کے تمام شکوک وشبہات کا جواب مختلف انداز سے مطبوع صورت میں موجود ہے۔[1]

[1] اس موضوع پر مولانا حکیم محمد ادریس فاروقی رحمہ اللہ کی کتاب ''مقام رسالت علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام'' ایک قابلِ مطالعہ کتاب ہے۔

احادیثِ مبارکہ کو تسلیم نہ کیا جائے تو قرآنِ مجید پر عمل بھی ممکن نہیں۔ پھر مرضی کا اسلام ہوگا اور ہر ایک کی اپنی خواہشات ہی اسلام ہوں گی۔ اور مذکورہ لوگوں کی عمومی حالت ایسی ہی ہے، لہٰذا جو احادیث صحیح یا حسن ہیں انھیں رسول اللہ ﷺ کا قول و عمل یا سکوت ماننا ہی حدیث کا بنیادی ادب ہے۔

2 مطالعہ حدیث

حدیث کے بارے میں جاننا اور کتب حدیث کا مطالعہ کرنا یہ حدیث کا بہترین ادب ہے۔ خیر القرون کی شخصیات نے جس قدر اہتمام سے احادیث کو محفوظ کیا اور آگے پہنچایا اس کا اولین مقصد بھی یہی تھا کہ بعد میں آنے والے مسلمان ان سے استفادہ کریں۔ علمِ حدیث کو باحفاظت بعد والی نسلوں تک منتقل کرنا ہم پر ایک قرض ہے اور یہ قرض اسی صورت میں اتر سکتا ہے جب ہم اس علم کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیں۔ مراکز قائم کریں اور لائبریریوں کی بنیاد رکھیں جن میں مسلمانوں کے لیے اپنے پیغمبر ﷺ کی احادیث مبارکہ کو پڑھنے اور سمجھنے کا خوب اہتمام ہو۔

حدیث میں آتا ہے کہ جب قبر میں منافق یا کافر سے محمد کریم ﷺ کے بارے میں سوال ہوگا تو وہ کہے گا: میں نہیں جانتا۔ میں تو وہی کچھ کہا کرتا تھا جو لوگ کہتے تھے تو اس سے کہا جائے گا:

((لَا دَرَيْتَ وَلَا تَلَيْتَ)).

''نہ تو نے کچھ سمجھا اور نہ ہی پڑھا۔''[1]

اس حدیث سے واضح ہے کہ زندگی میں کیا ہوا ہمارا مطالعۂ حدیث قبر کی اندھیری

[1] صحيح البخاري، حديث:1374.

کوٹھڑی میں ہمارے کام آئے گا۔

ــ حدیث مبارکہ کا مطالعہ محبت و سرور کی ایسی شاہراہ ہے جس پر مسلمان اپنے محبوب پیغمبر ﷺ کی حیات طیبہ کے شب و روز کا مشاہدہ کرتا اور آپ کی حکمت سے لبریز احادیث پڑھتا ہے۔ چودہ صدیاں بیت جانے کے بعد بھی اپنے آپ کو اسی دور میں محسوس کرتا ہے اور پیش آمدہ مشکلات کا حل احادیث نبویہ کی روشنی میں تلاش کرتا ہے۔

احادیث مبارکہ کا یہ مطالعہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا کا سبب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کی بنیاد رسول اللہ ﷺ کے اتباع کو قرار دیا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ﴾

"(اے پیغمبر!) کہہ دیجیے: اگر تم اللہ کی محبت چاہتے ہو تو میرا اتباع کرو تو اللہ بھی تم سے محبت کرے گا۔"[1]

منکرین حدیث کی نگاہ میں ذخیرۂ احادیث کالعدم ہے تو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا مطلب اس دور میں کیا ہوسکتا ہے؟ بہر حال اس سے واضح ہوتا ہے کہ نبی ﷺ کے اتباع کے راستے سے اللہ کی محبت کو حاصل کرنے والے ہر دور میں ہوں گے اور آپ ﷺ کے اتباع کے لیے احادیث مبارکہ کا مطالعہ یا کم از کم سماع انتہائی ضروری ہے۔ اس کے بغیر اللہ تعالیٰ سے محبت کی منزل نہیں مل سکتی!!

[3] احادیث کو مطلق طور پر تسلیم کرنا

تعصب، عناد اور ہٹ دھرمی نے ہمیں یہاں لا کھڑا کیا ہے کہ ہم اپنے اپنے مسلک کے امتیازی مسائل کی حد کو قائم رکھنے کے لیے صرف انھی احادیث کو بخوشی قبول کرتے

[1] آل عمران 31:3.

ہیں جن سے بظاہر اپنے مسلک کی تائید ہوتی ہو۔ مگر جو احادیث تمام مسالک کے ہاں مسلمہ ہیں ان کا مطالعہ کیا جاتا ہے نہ ان پر عمل ہوتا ہے۔ ایسی تحریریں پڑھ کر اور ایسی تقریریں سن کر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام فقط دو چار امتیازی مسائل پر عمل کا نام ہے۔ اگر ہمارے ہاں مطلق طور پر احادیث کی اہمیت ہوتی تو جن احادیث پر سب کا اتفاق ہے ہمارے قول اور عمل سے ہر ایسی حدیث کی اہمیت عیاں ہوتی۔ اور انھیں فریم کروا کر مساجد میں آویزاں کیا جاتا اور عملی اظہار بھی کیا جاتا۔

4 احادیث کو دوسروں تک پہنچانا

نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عبدالقیس کا وفد حاضر ہوا۔ آپ نے انھیں ارشادات سے نوازا اور فرمایا:

((اِحْفَظُوهُ وَأَخْبِرُوهُ مَنْ وَّرَاءَ كُمْ)).

''انھیں یاد کرلو اور جو یہاں نہیں آ سکے انھیں بھی بتاؤ۔''[1]

خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا تھا:

((وَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ)).

''جو یہاں موجود ہے وہ غیر موجود حضرات تک یہ سب کچھ پہنچا دے۔''[2]

آپ ﷺ نے احادیث مبارکہ کو یاد کر کے آگے پہنچانے والے کے لیے بڑی Unique اور منفرد دعا کی ہے:

((نَضَّرَ اللّٰهُ امْرَأً سَمِعَ مِنَّا حَدِيثًا فَحَفِظَهُ حَتّٰى يُبَلِّغَهُ)).

[1] صحيح البخاري، حديث:87۔ [2] صحيح البخاري، حديث:104.

”اللہ تعالیٰ اس شخص کو تروتازہ رکھے جس نے ہم سے حدیث کو سنا پھر یاد کیا اور (جوں کا توں) اسے آگے پہنچا دیا۔“[1]

مذکورہ احادیث مبارکہ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا طرز عمل یہ سمجھنے کو کافی ہے کہ ہر ایک کو احادیث مبارکہ دوسروں تک پہنچانی چاہئیں۔ حدیث مبارکہ کی ان پُرضیا کرنوں سے عالم بقعۂ نور بن سکتا ہے۔

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے نام اور کام سے کون واقف نہیں۔ انھوں نے اپنی خلافت کے دوران مدینہ منورہ کے گورنر ابوبکر بن حزم رحمہ اللہ کو لکھا تھا: ”جو بھی حدیثِ رسول ﷺ نظر آئے اسے لکھ لیجیے کیونکہ مجھے علم کے مٹ جانے اور علماء کے رخصت ہو جانے کا خدشہ ہے۔“[2]

اس سے اندازہ کیجیے پہلے حکمران حدیث مبارکہ کے تحفظ کا کس قدر اہتمام کیا کرتے تھے۔ یقیناً ان کے نام جو تاریخ نے محفوظ کر رکھے ہیں اس کی ایک بنیادی وجہ یہی ہے کہ وہ احادیث مبارکہ پر جان چھڑکتے تھے۔

احادیث مبارکہ کو آگے پہنچانے کے لیے کتب و رسائل اور اخبارات کی صورت میں پرنٹ میڈیا، الیکٹرانک میڈیا، جس میں موبائل بھی شامل ہے، سے درس و وعظ کا سہارا لیا جانا چاہیے۔

علاوہ ازیں میل ملاقات کے دوران اور پیش آمدہ صورتِ حال میں احادیث کو آگے پھیلانا بھی بہت بار آور ہے۔ اپنے اسلاف کا طرزِ عمل دیکھیے۔ امام ابنِ مبارک رحمہ اللہ نے طَرسوس[3] میں جہاد کے لیے روانہ ہوتے ہوئے محمد بن ابراہیم

---

[1] سنن أبي داود، حديث:3660۔ [2] صحيح البخاري، قبل الحديث:100۔ [3] طرسوس: یہ ترکی کا ایک رہائشی علاقہ ہے جو قدیم روم اور شام کے سرحدی علاقے میں واقع ہے۔ (معجم البلدان)۔

ابوسکینہ کو فضیل بن عیاض رحمہ اللہ کے نام چند اشعار لکھوائے جن کا مطلع یہ تھا:

یَا عَابِدَ الْحَرَمَیْنِ لَوْ أَبْصَرْتَنَا
لَعَلِمْتَ أَنَّكَ فِي الْعِبَادَةِ تَلْعَبُ
مَنْ كَانَ يَخْضِبُ خَدَّهُ بِدُمُوعِهِ
فَنُحُورُنَا بِدِمَائِنَا تَتَخَضَّبُ

''اے مکہ اور مدینہ کے عبادت گزار! اگر تو ہمارا حال دیکھے تو تجھے یقین آ جائے کہ تو نے عبادت کو ایک کھیل بنایا ہوا ہے۔ وہ شخص جس نے اپنے رخسار (اللہ کی یاد میں) اپنے آنسوؤں سے تر کر لیے ہیں، میدان جنگ میں ہمیں آ کر دیکھے کہ ہماری گردنیں (اس کی محبت میں) خون سے رنگین ہو رہی ہیں۔''

محمد بن ابراہیم رحمہ اللہ نے جب یہ تحریر سیدنا فضیل بن عیاض رحمہ اللہ کو پہنچائی اس وقت وہ مسجد حرام میں تھے۔ ان کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ اور کہنے لگے: ابوعبدالرحمن نے بالکل ٹھیک کہا ہے اور مجھے نصیحت کی ہے۔

اس کے بعد فضیل بن عیاض رحمہ اللہ نے محمد بن ابراہیم سے پوچھا: آپ حدیث لکھنے کے شعبے سے منسلک ہیں؟

محمد بن ابراہیم رحمہ اللہ: جی ہاں!

فضیل بن عیاض رحمہ اللہ: تو پھر یہ حدیث لکھ لو۔ یہ جو تم خط لے کر میرے پاس آئے ہو یہ اس کا معاوضہ ہے۔ پھر فضیل بن عیاض رحمہ اللہ یوں حدیث لکھوانے لگے: ہم سے منصور بن معتمر رحمہ اللہ نے اور انھوں نے ابو صالح سے اور انھوں نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ ایک شخص بارگاہِ نبوی میں عرض کرنے لگا: اللہ کے رسول! مجھے کوئی ایسا عمل

سکھائیے جس سے میں اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والوں کا اجر پالوں۔

فرمایا:

((هَلْ تَسْتَطِيعُ أَنْ تُصَلِّيَ فَلَا تَفْتُرَ، وَتَصُومَ فَلَا تُفْطِرَ؟))

''کیا تم بغیر وقفے کے مسلسل نمازیں اور بلا ناغہ روزے رکھ سکتے ہو؟''

انھوں نے عرض کی: اللہ کے رسول! مجھ میں تو یہ ہمت نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((فَوَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ! لَوْ طُوِّقْتَ ذٰلِكَ مَا بَلَغْتَ الْمُجَاهِدِينَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ أَوَ مَا عَلِمْتَ أَنَّ فَرَسَ الْمُجَاهِدِ لَيَسْتَنُّ فِي طِوَلِهِ، فَيُكْتَبُ لَهُ بِذٰلِكَ الْحَسَنَاتُ)).

''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر تم اس کی ہمت بھی رکھو تو بھی تم راہِ الٰہ میں جہاد کرنے والوں تک نہیں پہنچ سکتے۔ کیا تم جانتے نہیں کہ مجاہد کا گھوڑا ایک لمبی رسی باندھے چرتا رہتا ہے تو اس پر بھی مجاہد کے لیے نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔''[1]

ضرورت کے موقع پر اور ذوق و شوق سے احادیث سننا سنانا اور لکھنا بتانا یہ وہ طریقہ ہے جس پر اس امت کے پہلے لوگوں کا عمل تھا۔ وہ احادیث مبارکہ محض تعلیم کے لیے نہیں بلکہ اپنانے کے لیے آگے پھیلاتے تھے، اس کا نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ فوراً انھیں اپنا لیا جاتا تھا۔ مثلاً طاعون کے متعلق حدیث کے راوی سیدنا عبدالرحمن بن

[1] تاریخ دمشق: 307/34۔ اس واقعے میں درج الفاظ حدیث کا مفہوم صحیح بخاری، حدیث: 2785 میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

عوف رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہ بڑا اہم مسئلہ تھا۔ مگر عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے اس بارے میں حدیث اس وقت بیان کی جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں شام کے علاقے میں یہ وبا پھوٹی۔ وہ وبائی علاقے میں جانے کے بارے میں سوچ رہے تھے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مشورہ جاری تھا مگر فیصلہ کن مرحلے میں داخل نہ ہوا تھا۔ عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ موجود نہ تھے، وہ تشریف لائے تو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث بیان کی:

((إِذَا سَمِعْتُمْ بِهِ بِأَرْضٍ فَلَا تَقْدَمُوا عَلَيْهِ وَإِذَا وَقَعَ بِأَرْضٍ وَأَنْتُمْ بِهَا فَلَا تَخْرُجُوا فِرَارًا مِنْهُ)).

"جب تم کسی علاقے کے متعلق سنو کہ وہاں طاعون ہے تو وہاں نہ جاؤ اور اگر طاعون اس علاقے میں پھیل جائے جہاں تم موجود ہو تو وہاں سے بھاگ کر دوسرے علاقے میں نہ جاؤ۔"[1]

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ اور وہاں سے واپس ہو گئے۔

ایک اور مثال

کسی کا دروازہ زیادہ سے زیادہ کتنی دفعہ کھٹکھٹایا جائے؟ اس کی بابت حدیث سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے اس وقت سنائی جب تین دفعہ دستک دینے کے باوجود سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے ہاں سے کوئی جواب نہ آیا اور سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ واپس چل دیے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے بغیر ملے واپس چلے جانے کی وجہ پوچھی تو انھوں نے یہ حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سنا دی۔

[1] صحيح البخاري، حديث:5729.

((إِذَا اسْتَأْذَنَ أَحَدُكُمْ ثَلَاثًا، فَلَمْ يُؤْذَنْ لَهُ فَلْيَرْجِعْ)).

''جب تم میں سے کوئی شخص تین مرتبہ اجازت مانگے اور اسے اجازت نہ ملے تو اسے واپس آجانا چاہیے۔''[1]

نبی ﷺ کے بعد خلافت کے مسئلے کو ایک حدیث نے حل کر دیا کہ اَلْأَئِمَّةُ مِنْ قُرَيْشٍ اس سے قبل اکثریت اس حدیث سے ناواقف تھی۔[2]

ابو شریح عدوی رضی اللہ عنہ نے خطبہ حجۃ الوداع اور مکہ مکرمہ کی حرمت کی حدیث عمرو بن سعید جو یزید کے دور میں مدینہ کا گورنر تھا، کو اس وقت سنائی جب وہ مکہ مکرمہ کی طرف لشکر کشی کر رہا تھا۔[3]

لہٰذا احادیث کو آگے پہنچانے کا مؤثر ترین ذریعہ یہ ہے کہ جب ضرورت محسوس کریں کہ یہاں پر حدیث بیان کرنے کی ضرورت ہے تو بیان کر دیں۔ مثلاً کسی نے چھینک لی ہے اور الحمد للہ نہیں کہا، اسے اسی موقع پر بتا دیا جائے۔ اس میں ضروری ہے کہ کہنے والے کا اپنا عمل اس پر پہلے سے گواہ ہو۔ اس کا یہ مطلب قطعاً نہیں کہ موقع محل کے بغیر یا تعلیم کے لیے قرآن و حدیث بیان نہ ہوں۔ قرآن و حدیث کی تعلیمات کو ہر وقت ہر ایک کے لیے بیان کیا جانا اور اپنانا چاہیے۔ قرآن و حدیث کا علم ہی حقیقت میں صدقہ جاریہ ہے۔ اس وجہ سے اسے زیادہ سے زیادہ پھیلانا چاہیے۔

اس بارے میں ایک احتیاط لازمی ہے وہ یہ کہ جس فرمان کو آگے پہنچایا جا رہا ہے وہ کسی صحیح یا حسن حدیث سے ثابت ہو۔ لیکن عمومی طور پر اس معاملے میں بالکل احتیاط نہیں

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 6245۔ [2] إرواء الغليل، حديث: 520۔ [3] صحيح البخاري، حديث: 104.

کی جاتی۔ اور تو اور بعض نصابی کتابوں میں کسی کے اقوال کو حدیث کہہ کر درج کر دیا جاتا ہے۔

5 حدیث کے بارے میں بنیادی معلومات حاصل کرنا

بحیثیت مسلمان ہمیں حدیث سے متعلقہ بنیادی معلومات ہونی چاہئیں۔ یہ بھی حدیث کی اہمیت اورادب و احترام کی ایک صورت ہے۔ ہمیں پتہ ہونا چاہیے کہ حدیث کسے کہتے ہیں؟ حدیث کی کتابیں کون کون سی ہیں؟ ان کا اسلوب کیا کیا ہے؟ ان سے حدیث کیسے تلاش کی جا سکتی ہے؟ اور یہ کہ ان میں درج حدیثوں کا حکم کیا ہے؟ ان سوالوں کے جواب سے محدثین کرام رحمہم اللہ کی خدماتِ حدیث کا اندازہ ہوتا ہے اور حدیث کی قدر و منزلت سے آگاہی ہوتی ہے۔ تعظیم و تکریم اسی صورت میں ہوتی ہے جب کسی چیز کی قدر و منزلت کا اندازہ ہو۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کو اسی اہمیت اور معرفت نے مجبور کر دیا کہ بھڑ ڈنک مارتی رہی مگر انھوں نے درس حدیث جاری رکھا۔

6 کتب احادیث کا ادب و احترام

جیسے احادیث مبارکہ قابل احترام ہیں اسی طرح جن کتب میں یہ احادیث درج ہیں وہ بھی ہمارے ہاں تعظیم کے قابل ہونی چاہئیں۔ حدیث مبارکہ کی کتاب پر قرآنِ مجید کے علاوہ اور کوئی کتاب نہ رکھی جائے۔ یہ ادب میں شامل ہے۔ ادب سے کورے لوگ پھل نہیں پایا کرتے۔ قرآن مجید کے بعد احادیث مبارکہ علم کا بنیادی ماخذ ہیں ان کا احترام امت مسلمہ پر واجب ہے۔

حدیث مبارکہ کے سوءِ ادب کی چند صورتیں

1 صحیح یا حسن احادیث کو ردّ کر دینا

▪ مسلک کے جن بتوں کی پوجا ہو رہی ہے ان بتوں نے اپنے ماننے والوں کو اس حد تک مجبور کر دیا ہے کہ وہ مقبول احادیث صرف اس وجہ سے نہیں مانتے کہ وہ ان کے مسلک کے خود ساختہ قواعد و احکام کے خلاف ہیں، جبکہ بنیادی طور پر سب کا یہی ماٹو ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ پر عمل کر کے ہی کامیاب ہو سکتے ہیں۔

▪ احادیث کو ٹھکرا دینے کا یہ سلسلہ زبانی و تحریری بھی ہے مگر بہت کم۔ مسلمانوں کی عمومی حالت یہ ہے کہ اپنے عمل سے احادیث مبارکہ کو ردّ کرتے ہیں۔ مسلمان کا یہ طرزِ عمل جہاں احادیث مبارکہ کی سوءِ ادبی کی بدترین صورت ہے وہاں رسول اکرم ﷺ کی بھی توہین ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طرزِ عمل تو یہ تھا کہ حدیث مبارکہ سن کر اس پر کاربند ہو جاتے تھے۔ جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((أَرْضُوا مُصَدِّقِيكُمْ)).

"زکوٰۃ وصول کرنے والوں کو راضی کر کے بھیجا کرو۔"

سیدنا جریر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب سے رسول اللہ ﷺ سے میں نے یہ الفاظ سنے ہیں اس دن سے آج تک کوئی تحصیلدار مجھ سے ناراض ہو کر نہیں گیا۔[1]

▪ احادیث کو ردّ کر دینے کی ایک وجہ عقل بھی ہے۔ عقل تو ہمارے لیے چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے۔ جن لوگوں نے احادیث کو، خواہ وہ معجزات سے متعلقہ ہوں یا اپنی

[1] صحیح مسلم، حدیث:989.

ناقص تحقیقات کی روشنی میں بظاہر متعارض، اپنی عقل کی میزان میں تولنا چاہا، ان میں سے اکثر راہ راست سے بھٹک گئے۔

- اسی طرح بعض اوقات احادیث کا باہمی اور ظاہری تعارض ''تعلیم یافتہ طبقے'' کی طرف سے احادیث کو ٹھکرانے کا سبب بن جاتا ہے۔
- قرآن مجید کی آیات کی طرح احادیث میں بھی تاویل وتحریف کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ یہ احادیث مبارکہ کی بہت بڑی بے ادبی اور گستاخی ہے۔ ان کو تاویل وتحریف کی بھینٹ چڑھانے کے بجائے اپنا نقطہ نظر بدلنا چاہیے۔
- احادیث مبارکہ کو اس لیے ردّ کر دینا کہ امام صاحب کے قول کے خلاف ہے۔ حالانکہ وہ امام کہلانے کا حق دار ہی نہیں جس کا قول حدیث مصطفیٰ ﷺ کے خلاف ہو۔ یہ تو ممکن ہے کسی امام کو قولِ رسول ﷺ کا علم نہ ہو لیکن اگر بعد والوں کو تمام احادیث پتہ چل جائیں تو انھیں یہ نظریہ یا موقف قطعاً نہیں اختیار کرنا چاہیے۔
- بعض احادیث کی صحت وضعف میں عدم احتیاط بھی احادیث مبارکہ کو ردّ کرنے کا سبب بن جاتی ہے۔ دور حاضر کے کتنے ''محققین'' ہیں جن کے اس رویے نے یک جنبش قلم کئی احادیث کو قابل عمل نہیں رہنے دیا۔ یہ معاملہ بہت زیادہ احتیاط کا متقاضی ہے مگر اس میں احتیاط نہیں کی جا رہی۔ اس کے انتہائی خطرناک نتائج برآمد ہوں گے بلکہ ہو رہے ہیں۔

[2] احادیث مبارکہ کو اہمیت نہ دینا

بہت سے مدارس میں دینی علوم کے نام پر احادیث مبارکہ کے علاوہ تمام علوم کو بڑی فوقیت حاصل ہے۔ احادیث میں وارد فقہ کے مفہوم اور فضیلت کو ایک خاص

مسلک کی فقہ باور کیا جانے لگا ہے۔ یقیناً انھیں اپنے اس موقف پر نظر ثانی کر کے احادیث کو اہمیت دینا ہوگی۔ یہی ہمارا زادِ آخرت ہے۔

3 کسی کے قول کو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر دینا

اس معاملے میں بہت بے احتیاطی سے کام لیا جاتا ہے، حالانکہ رسول اللہ ﷺ کا واضح فرمان ہے:

((مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ)).

''جس نے جان بوجھ کر میری طرف جھوٹی بات منسوب کی وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لے۔''[1]

یہ وعید اس لیے ہے کہ آپ ﷺ کی طرف کوئی بات منسوب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دین ہے اور غیر نبی کی باتیں ہمارے لیے دین کیسے بن سکتی ہیں۔ اس طرح تو احادیث کا دیگر باتوں سے امتیاز ختم ہو جاتا ہے۔ پہلے یہ کام صرف کتابوں تک محدود تھا اب یہ باتیں موبائل پر حدیث کے نام سے گھومتی ہیں۔ یہ بہت بڑا جرم ہے اور ثواب کے بجائے عذاب کا مستوجب ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو احادیثِ مبارکہ کا ادب واحترام کرنے کی توفیق دے۔ آمین

[1] صحيح البخاري، حديث: 107، و صحيح مسلم، حديث: 3.

باب: 6

حرمین شریفین، بیت المقدس اور مساجد کا ادب و احترام

حقیقی ادب و احترام کے لائق اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی ہے، پھر اس کے جملہ انبیاء و رسل اور رسولوں کے سردار حضرت محمد ﷺ، اس کی آخری کتاب اور دیگر کتب سماویہ اور اس کی طرف منسوب جگہیں۔ یہ اسی کا حق ہے کہ اس نے لوگوں میں سے انبیاء و رسل علیہم السلام کا انتخاب فرمایا، مہینوں میں سے حرمت والے مہینوں کو منتخب فرمایا، دنوں میں جمعۃ المبارک کے دن کو چنا اور شہروں میں سے بلد حرام کا انتخاب فرمایا اور مدینہ منورہ کو خاتم الانبیاء ﷺ کی قدم بوسی کی سعادت بخشی۔

انسان کی فطرت ہے کہ جس سے محبت یا نفرت رکھتا ہے اس کی طرف منسوب چیزوں اور وابستہ لوگوں سے بھی اسے اسی قدر محبت یا نفرت ہوتی ہے۔ سیدنا ثمامہ بن اثال رضی اللہ عنہ نے اس حقیقت کا اظہار قبول اسلام کے فوراً بعد ان الفاظ سے کیا:

((يَا مُحَمَّدُ! وَاللّٰهِ! مَا كَانَ عَلَى الْأَرْضِ وَجْهٌ أَبْغَض إِلَيَّ مِنْ وَّجْهِكَ فَقَدْ أَصْبَحَ وَجْهُكَ أَحَبَّ الْوُجُوهِ إِلَيَّ. وَاللّٰهِ !مَا كَانَ مِنْ دِينٍ أَبْغَضَ إِلَيَّ مِنْ دِينِكَ فَأَصْبَحَ دِيْنُكَ أَحَبَّ الدِّيْنِ إِلَيَّ. وَاللّٰهِ! مَا كَانَ مِنْ بَلَدٍ أَبْغَضَ إِلَيَّ مِنْ بَلَدِكَ فَأَصْبَحَ بَلَدُكَ أَحَبَّ الْبِلَادِ إِلَيَّ)).

”اے محمد (ﷺ)! اللہ کی قسم! پوری زمین پر آپ کے چہرے سے زیادہ ناپسندیدہ چہرہ کوئی نہیں تھا اور اب آپ کا چہرہ مبارک تمام چہروں سے محبوب ترین ہو گیا ہے۔ اللہ کی قسم! آپ کا دین بھی مجھے تمام دینوں سے زیادہ ناپسندیدہ تھا اور اب آپ کا دین تمام دینوں سے زیادہ محبوب ہو گیا ہے۔ اللہ کی قسم! آپ کا شہر مجھے سب سے زیادہ ناپسند تھا مگر اب وہ میرے نزدیک تمام شہروں سے زیادہ پسندیدہ ہو گیا ہے۔“[1]

علاوہ ازیں یہ بھی انسانی فطرت ہے کہ وہ کسی نہ کسی مرکز سے وابستہ ضرور رہتا ہے۔ سیاسی لوگوں کی اپنی پناہ گاہیں اور مذہبی لوگوں کی اپنی خانقاہیں اور مراکز، اور کئی لوگوں کی اپنی درگاہیں اور آستانے ہوتے ہیں، بعض اوقات وہ اپنے آستانوں کو حرم شریف سے بہتر یا کم از کم برابر قرار دے لیتے ہیں۔ ان کی عبادت کا کعبہ وقبلہ کوئی اور ہوتا ہے اور محبت کا محور و مرکز بھی کوئی اور، اسی لیے تو وہ مناسک حج کسی آستانے پر ادا کر لیتے ہیں۔ انھوں نے یہ اصول بنا رکھا ہے ع

عاشقاں دا خانہ کعبہ یار دا دوارا ہوندا

”عاشقوں کا خانہ کعبہ ان کے محبوب کا آستانہ اور چوکھٹ ہوتی ہے۔“ لیکن جو لوگ قرآن وسنت کی خالص تعلیمات سے بہرہ ور ہوتے ہیں وہ ادب و احترام کا یہ مقام کسی اور کو نہیں دیتے۔

اسی طرح غیر مسلم بھی اپنے اپنے مراکز سے وابستہ ہیں کوئی ویٹی کن سٹی سے، کوئی دیوار گریہ سے، کوئی مندروں سے کوئی ننکانہ کے گردوارے سے۔ انسان کی اس فطرت کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے اہل اسلام کو بھی تین مراکز سے نوازا ہے: 1 بیت اللہ الحرام۔

---

[1] صحیح البخاري، حدیث:4372.

2 مسجد نبوی شریف۔ 3 بیت المقدس۔

1 بیت اللہ، دنیا کے بت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ﴾

''یقیناً پہلا گھر جو لوگوں کے لیے بنایا گیا وہ ہے جو مکہ میں ہے۔''[1]

اس کی تاریخ تو ایک علیحدہ موضوع ہے مگر شروع دن سے اس کا احترام برقرار ہے۔ یہاں کے رہنے والوں کا بھی بہت احترام تھا۔ قریش کی ساری سیادت و قیادت اسی کی رہین منت تھی حتی کہ جن قربانی کے جانوروں کا رخ اس گھر کی طرف ہو جاتا اور ان کے گلوں میں ہار یا قلادے ڈال دیے جاتے تو لوگ ان کا بھی احترام کرتے تھے۔ ان کا رخ کعبۃ اللہ کی طرف کر دیتے، ان کے ساتھ کوئی ناروا سلوک نہ اپناتے۔ وہ کعبہ کی طرف جانے والے ان جانوروں کا اس قدر احترام کرتے کہ ان پر سوار ہونا بھی توہین سمجھتے تھے جیسا کہ ایک شخص قربانی کا اونٹ لیے جا رہا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((اِرْکَبْھَا)).

''اس پر سوار ہو جا۔''

اس نے جواب دیا کہ یہ قربانی کا اونٹ ہے۔ آپ ﷺ نے دو یا تین مرتبہ فرمایا

1 آل عمرٰن 96:3.

ب جا کر وہ اونٹ پر سوار ہوا۔[1]

اس کا مطلب ہے کہ اس کے ذہن میں یہ چیز راسخ تھی کہ جن جانوروں نے وہاں قربان ہونا ہے ان کا اس حد تک احترام کرنا ہے کہ ان پر سوار ہی نہیں ہونا۔

اس واقعے سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ادب و احترام انھی ضابطوں کی روشنی میں ہو گا جو شریعت نے مقرر کر دیے ہیں۔ یا جن کا جواز فراہم کیا ہے۔ اپنی طرف سے ادب و احترام کے سارے ''ٹوٹکے'' ناکارہ ہوتے ہیں، چنانچہ آپس میں ملتے ہوئے ''المدینہ'' کہنے سے مدینہ منورہ کا احترام ہوتا ہے یا نہیں مگر اس ہستی کی مخالفت ضرور ہوتی ہے جس کی وجہ سے مدینہ منورہ کو یہ اعزاز نصیب ہوا۔ کیونکہ آپ ﷺ کی تعلیم تو یہ ہے کہ

((وَسَلِّمْهُ إِذَا لَقِيتَ)).

''اور مسلمان بھائی سے جب ملے تو اسے سلام کیا کر۔''[2]

تقویٰ کی علامات

حج کے زیادہ تر مناسک اور مقامات سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے متعلقہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنے شعائر قرار دیا ہے اور فرمایا:

﴿لَا تُحِلُّوا شَعَائِرَ اللَّهِ﴾

''اللہ کے شعائر کی بے حرمتی نہ کرو۔''[3]

بلکہ یہاں تک فرما دیا:

[1] صحيح البخاري، حديث:1690۔ [2] صحيح مسلم، حديث:2162۔ [3] المآئدة2:5.

﴿وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ﴾

''اور جو کوئی اللہ کے شعائر کی تعظیم کرتا ہے تو یہ دلوں کے تقوی (کی علامات) میں سے ہے۔''[1]

گویا کہ تقویٰ کے مفہوم میں گناہوں سے بچنے کے ساتھ ساتھ شعائر اللہ کی تعظیم بھی داخل ہے۔

مکہ مکرمہ اللہ تعالیٰ کا محبوب ترین شہر

نبی کریم ﷺ نے مکہ مکرمہ سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا:

((وَاللّٰهِ! إِنَّكِ لَخَيْرُ أَرْضِ اللّٰهِ وَأَحَبُّ الْبِلَادِ إِلَى اللّٰهِ وَلَوْلَا أَنِّي أُخْرِجْتُ مِنْكِ مَا خَرَجْتُ)).

''اللہ کی قسم! (اے مکہ!) تو اللہ کی زمین کا بہترین حصہ اور اللہ تعالیٰ کا محبوب ترین علاقہ ہے۔ اگر مجھے یہاں سے نہ نکالا جاتا میں کبھی نہ نکلتا۔''[2]

عازمینِ مکہ کا احترام

شریعت کی نگاہ میں اس گھر کا اور اس گھر کے عازمین کا بڑا احترام ہے۔ 12 اسلامی مہینوں میں سے 4 حرمت والے ہیں، جبکہ ان میں سے تین مہینوں کا تعلق اس گھر کے عازمین کے سلسلے میں ہے۔ یہ ذوالحجہ سے پہلے ذوالقعدہ اور ذوالحجہ کے بعد محرم کے مہینے ہیں کہ حرم کی طرف آتے ہوئے اور واپس جاتے ہوئے بھی کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

[1] الحج 22:32۔ [2] السنن الکبریٰ:2/479۔

﴿وَلَا آمِّينَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ﴾
’’اور نہ بیت الحرام کا قصد کرنے والوں کی (بے حرمتی کرو۔)‘‘ [1]

ہمارا قبلہ کیونکر قابل تعظیم نہ ہو؟

سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ خانہ کعبہ کو ہمارا قبلہ قرار دیا گیا ہے۔ اور اس کے قبلہ قرار دلوانے میں ہمارے محبوب پیغمبر ﷺ کی تڑپ اور لگن، جسے قرآن نے ﴿قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ...﴾ کی شکل دی ہے، اس گھر کی عظمت کو ہمارے دلوں میں مزید بڑھا دیتی ہے۔ اور یہی عظمت اور محبت اس کا ادب و احترام کرنے پر ابھارتی ہے۔

قبلے کی طرف تھوکنے کی ممانعت

ارشاد نبوی ہے:

((فَلَا يَبْزُقَنَّ أَحَدُكُمْ قِبَلَ قِبْلَتِهِ)).
’’تو تم میں سے کوئی ہرگز اپنے قبلے کی طرف نہ تھوکے۔‘‘ [2]

اسی طرح سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بتاتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے قبلے والی دیوار پر تھوک دیکھا تو اسے کھرچ دیا۔‘‘ [3]

علاوہ ازیں آپ ﷺ نے قبلے کی طرف تھوکنے پر شدید وعید فرمائی ہے۔ ارشاد گرامی ہے:

((مَنْ تَفَلَ تُجَاهَ الْقِبْلَةِ جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَتَفْلُهُ بَيْنَ عَيْنَيْهِ)).
’’جس شخص نے قبلے کی طرف تھوکا وہ روز قیامت اس طرح آئے گا کہ اس کا

[1] المآئدة 5:2۔ [2] صحيح البخاري، حديث: 405۔ [3] صحيح البخاري، حديث: 407.

تھوک اس کی آنکھوں کے درمیان ہوگا۔"[1]

علامہ البانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ نماز میں قبلہ رخ تھوکنے کی ممانعت توصحیحین اور دیگر کتب کی کئی احادیث سے ثابت ہے مگر میں نے سلسلہ صحیحہ میں مذکورہ حدیث کو اس لیے ترجیحاً شامل کیا ہے کہ اسے بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ اور اس بارے میں احادیث بھی کم ہیں۔ اور اس لیے بھی یہ روایت ذکر کی ہے کہ اس میں کعبۃ اللہ کا بہت بڑا ادب پنہاں ہے۔ عام لوگ تو اس سے غافل ہیں ہی مگر خواص بھی توجہ نہیں دیتے۔ میں نے کتنے ائمہ مساجد کو دیکھا ہے وہ قبلے کی طرف والی کھڑکی سے باہر تھوکتے ہیں۔[2]

ٹائلٹ میں قبلے کی طرف منہ یا پیٹھ کرنے کی ممانعت

اسی طرح ٹائلٹ کے استعمال میں بھی کعبے کی طرف منہ کرنے یا پیٹھ کرنے کی ممانعت ہے۔ سیدنا ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ فرمان نبوی بیان کرتے ہیں:

((إِذَا أَتَيْتُمُ الْغَائِطَ فَلَا تَسْتَقْبِلُوا الْقِبْلَةَ وَلَا تَسْتَدْبِرُوهَا بِبَوْلٍ وَّلَا غَائِطٍ)).

"جب تم ٹائلٹ آؤ تو نہ قبلے کی طرف اپنا منہ کیا کرو اور نہ پیٹھ، خواہ پیشاب کرنا ہو یا قضائے حاجت۔"[3]

اسی طرح سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث نبوی ہے:

((مَنْ لَّمْ يَسْتَقْبِلِ الْقِبْلَةَ وَلَمْ يَسْتَدْبِرْهَا فِي الْغَائِطِ. كُتِبَ لَهُ حَسَنَةٌ وَّمُحِيَ عَنْهُ سَيِّئَةٌ)).

[1] السلسلة الصحيحة، حديث: 222 وسنن أبي داود، حديث:3824 ـ [2] السلسلة الصحيحة، تحت الحديث:223ـ [3] صحيح مسلم، حديث:264.

”جو شخص قضائے حاجت کے وقت نہ تو قبلے کی طرف منہ کرے اور نہ پیٹھ تو اس کے لیے ایک نیکی لکھ دی جاتی ہے اور ایک گناہ مٹا دیا جاتا ہے۔“[1]

مذکورہ احادیث مبارکہ سے یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ کعبۃ اللہ کا احترام اور اس کے سوء ادب کی تمام صورتوں سے احتراز ہماری مذہبی ذمہ داری ہے۔ ٹائلٹ کی تعمیر کے وقت اس کا پورا اہتمام کیا جائے کہ قبلے کی جانب نہ رخ ہو اور نہ پیٹھ۔

آپ ﷺ نے یہ حکم مدینہ منورہ میں دیا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا کے کسی بھی خطے میں رہنے والے مسلمان قبلے کے تقدس کا خیال رکھیں، خواہ ان کے اور کعبے کے درمیان جنگل، صحرا، سمندر اور فاصلے حائل کیوں نہ ہوں۔

جس کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنی ہے پھر اتنی لاج تو رکھنی ہے کہ ایسے کم تر کاموں میں اس کی طرف رخ نہ ہو۔

دیکھا! ہمارا دین ہمیں کیسے کیسے آداب کی تعلیم دیتا ہے۔

بہت سے مسلمان تھوکتے وقت بھی قطعاً خیال نہیں رکھتے کہ کہیں قبلے کی طرف نہ تھوک دیں۔ اللہ ہمیں سمجھ دے۔

رسول اللہ ﷺ کی زبان سے بیت اللہ کی تعظیم

ایک دن رسول اللہ ﷺ نے بیت اللہ کو دیکھا تو فرمایا:

((مَرْحَبًا بِكِ مِنْ بَيْتٍ مَا أَعْظَمَكِ وَأَعْظَمَ حُرْمَتَكِ! وَلَلْمُؤْمِنُ أَعْظَمُ حُرْمَةً عِنْدَ اللّٰهِ مِنْكِ)).

[1] السلسلة الصحيحة، حديث: 1098، و المعجم الكبير للطبراني: 19/158.

”اللہ کا گھر ہونے کی بنا پر تجھے مرحبا! تو کس قدر عظمت والا ہے اور تیری حرمت کس قدر عظیم ہے۔ اور یقینا مؤمن اللہ کے ہاں تجھ سے بھی زیادہ حرمت والا ہے۔“[1]

اس فرمان سے ہمیں جہاں مومن کی حرمت کا اندازہ ہوتا ہے وہاں یہ بھی پتا چلتا ہے کہ بیت اللہ کی حرمت کی پاسداری اور اس کا تحفظ اور پاسبانی ضروری ہے۔ اقبال نے اپنے الفاظ میں اسے یوں بیان کیا ہے ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے تا بخاک کاشغر

2 مدینہ منورہ

رسول اللہ ﷺ کو خواب میں ہجرت کی سرزمین دکھائی گئی۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((قَدْ أُرِيتُ دَارَ هِجْرَتِكُمْ، رَأَيْتُ سَبْخَةً ذَاتَ نَخْلٍ بَيْنَ لَابَتَيْنِ)).

”مجھے تمھاری ہجرت کا مقام دکھایا گیا ہے۔ میں نے ایک کھاری زمین دیکھی ہے۔ وہاں کھجور کے باغات بھی ہیں اور وہ دو پتھریلے میدانوں کے درمیان واقع ہے۔“

جب رسول اللہ ﷺ نے اس خواب کا ذکر کیا تو جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ہجرت کرنی تھی انھوں نے ہجرت شروع کر دی حتی کہ بعض مہاجرین حبشہ بھی مدینہ منورہ کی

[1] السلسلة الصحيحة، حديث:3420.

طرف لوٹ آئے۔[1]

بعدازاں آپ ﷺ نے بھی ہجرت فرمائی۔ ساتھ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی تھے۔

دارِ ہجرت

مدینہ منورہ دارالہجرت قرار پایا۔ اور رسول اللہ ﷺ نے اسے قدوم میمنت لزوم سے نوازا۔ اسے مہبط وحی (وحی اترنے کی جگہ) ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ آپ ﷺ کو مکہ مکرمہ کی طرح مدینہ منورہ سے بھی لگاؤ ہو گیا۔ آپ ﷺ نے اس کے پرانے نام ''یثرب'' کو تبدیل کیا کیونکہ یثرب کے معنی ہیں: ''ویرانہ، غیر آباد'' آپ ﷺ نے اس سرزمین کے ایسے نام کو بھی گوارا نہ کیا۔ ویسے بھی جہاں آپ ﷺ اقامت گزیں ہوں وہ غیر آباد یا ویرانہ ہو بھی کیسے سکتا ہے۔

سرکارِ مدینہ ﷺ کی مدینہ منورہ سے محبت

آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے مدینہ منورہ کے لیے جو دعائیں مانگیں ان کے مطالعے سے نبی ﷺ کے ہاں مدینہ منورہ کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مادرِ امت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اور بلال رضی اللہ عنہ کو بخار ہو گیا۔ انھوں نے کفار مکہ کے لیے بددعا کی:

''اے اللہ! شیبہ بن ربیعہ، عتبہ بن ربیعہ اور امیہ بن خلف پر لعنت فرما۔'' (کیونکہ ان کے ظلم و ستم کی وجہ سے وہاں سے ہجرت کرنا پڑی) اس کے بعد آپ ﷺ نے یہ دعا فرمائی:

---

[1] صحيح البخاري، حديث:2297.

((اَللّٰهُمَّ! حَبِّبْ إِلَيْنَا الْمَدِينَةَ كَحُبِّنَا مَكَّةَ أَوْ أَشَدَّ. اَللّٰهُمَّ! بَارِكْ لَنَا فِي صَاعِنَا وَفِي مُدِّنَا وَصَحِّحْهَا لَنَا. وَانْقُلْ حُمَّاهَا إِلَى الْجُحْفَةِ)).

''اے اللہ! ہمارے لیے مدینہ اس طرح محبوب بنا دے جیسے ہمیں مکہ محبوب ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ مدینہ سے محبت عطا فرما۔ اے اللہ! ہمارے (ناپ تول کے پیمانوں) صاع اور مد میں برکت دے دے۔ اے اللہ! اس کی آب و ہوا ہمارے لیے ساز گار بنا دے اور اس کی وبا اور بخار کو جحفہ منتقل کر دے۔''[1]

مدینہ منورہ کے لیے آپ ﷺ نے یہ دعا بھی فرمائی:

((اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ بِالْمَدِينَةِ ضِعْفَيْ مَا جَعَلْتَ بِمَكَّةَ مِنَ الْبَرَكَةِ)).

''اے اللہ! تو نے مکہ مکرمہ کو جن برکات سے نوازا ہے مدینہ منورہ کو ان سے دوگنی برکات سے نواز۔''[2]

اس دعا کی قبولیت کے اثرات پھر اس طرح ظاہر ہوئے کہ مدینہ سے آپ ﷺ کی محبت بڑھ گئی۔ آپ ﷺ کے خادم سیدنا انس رضی اللہ عنہ اس جذبہ حب الوطنی کو اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کرتے ہیں: ''جب نبی ﷺ سفر سے واپس آتے اور مبارک نگاہیں مدینہ کے در و دیوار پر پڑتیں تو اپنی اونٹنی کو بھگاتے اور اگر کسی اور سواری پر ہوتے تو مدینہ منورہ سے محبت کی وجہ سے اپنی سواری کو ایڑ لگاتے (تاکہ وہ تیز دوڑے)۔''[3]

نبی ﷺ نے مدینہ منورہ سے محبت کی دعا میں امتیوں کو بھی شامل کیا۔ شاید یہی وجہ

[1] صحيح البخاري، حديث:1889۔ [2] صحيح البخاري، حديث:1885۔ [3] صحيح البخاري، حديث:1886.

ہے کہ مکہ و مدینہ سے ہزاروں میل دور بیٹھے مسلمان ان کی زیارت کے لیے تڑپتے ہیں۔
یہ محبت نبوی مدینہ کی بستی کے ساتھ ساتھ اس کے پہاڑوں پر بھی اثر انداز ہونے لگی۔ اور رفتہ رفتہ آپ ﷺ کو مدینہ کے احد پہاڑ سے محبت ہوگئی۔ آپ ﷺ نے بھی اس کی محبت کو محسوس کیا۔ اور اس کا اظہار فرمایا:

((هٰذَا جَبَلٌ يُّحِبُّنَا وَنُحِبُّهُ)).

"یہ احد پہاڑ ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔"[1]

آپ ﷺ مدینہ منورہ کا ہر لحاظ سے استحکام چاہتے تھے۔ آپ کو یہ بھی پسند نہیں تھا کہ اس کے آس پاس کے متصل علاقے خالی ہو جائیں۔ بنو سلمہ کے لوگوں نے اپنے گھر بار چھوڑ کر مسجد نبوی کے قریب آنے کا ارادہ کیا۔ نبی ﷺ مدینہ منورہ کو اطراف و اکناف سے خالی دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ آپ نے بنی سلمہ کو حکم فرمایا:

((يَا بَنِي سَلِمَةَ! أَلَا تَحْتَسِبُونَ آثَارَكُمْ؟)).

"اے بنی سلمہ! کیا تم اپنے قدموں کے آثار کی وجہ سے ملنے والے ثواب کی امید نہیں رکھتے۔" یہ سننا تھا کہ انھوں نے منتقل ہونے کا ارادہ ترک کر دیا۔[2]

الغرض نبی کریم ﷺ کو مدینہ منورہ سے بڑی محبت تھی۔ جب اس قدر محبت ہے تو اس کا ادب واحترام اور دلی مقام بھی ضروری ہے۔ آپ ﷺ نے تو یہاں تک فرمایا:

((مَنِ اسْتَطَاعَ أَنْ يَّمُوتَ بِالْمَدِينَةِ فَلْيَمُتْ بِهَا فَإِنِّي أَشْفَعُ لِمَنْ يَّمُوتُ بِهَا)).

"جس سے ہو سکے کہ وہ مدینہ میں فوت ہو تو اسے مدینہ ہی میں فوت ہونا

[1] صحيح البخاري، حديث:7333۔ [2] صحيح البخاري، حديث:1887.

چاہیے کیونکہ جو مدینہ میں فوت ہوگا میں اس کی سفارش کروں گا۔''[1]

دراصل آپ ﷺ چاہتے تھے کہ مدینہ منورہ کی آبادی بھی بڑھے اور یہاں رہنے والا کوئی شخص واپس نہ جائے بلکہ یہاں ہی فوت ہو۔ یہ انسان کی اپنی کوشش ہے۔ موت تو جہاں لکھی ہے وہاں آنی ہے۔ مگر سعادت مندوں کی یہ آرزو بھی پوری ہو جاتی ہے۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے بھی مدینہ منورہ میں شہادت کی موت کی دعا ان الفاظ سے کی تھی:

((اَللّٰهُمَّ ! ارْزُقْنِي شَهَادَةً فِي سَبِيلِكَ، وَاجْعَلْ مَوْتِي فِي بَلَدِ رَسُولِكَ)).

''الٰہی! مجھے اپنے راستے میں شہادت کی موت نصیب فرمانا اور میری موت ہو بھی تیرے رسول ﷺ کے شہر میں۔''[2]

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی ام المومنین سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا نے آپ سے یہ سوال کیا کہ یہ کیسے ممکن ہے؟ آپ نے فرمایا: ''اللہ جب چاہے گا اس سے نواز دے گا۔''[3]

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ رضی اللہ عنہ کی یہ خواہش اس طرح پوری فرمائی کہ مدینہ منورہ ہی نہیں، مسجد نبوی ہی نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ کے مصلے پر آپ کو یہ اعزاز نصیب ہوا۔

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

نبی کریم ﷺ کی مدینہ منورہ سے یہ محبت آپ پر ایمان لانے والوں سے تقاضا کرتی ہے کہ وہ بھی مدینہ منورہ سے محبت کریں۔ اور اس کا دلی ادب و احترام بھی کریں اور محبت کا معیار یہ نہ رکھیں ؎

[1] جامع الترمذي، حديث: 3917، وسنن ابن ماجه، حديث: 3112۔ [2] صحيح البخاري، حديث:1890۔ [3] الطبقات لابن سعد:331/3، إسناده حسن.

میں ترے ﷺ مزار کی جالیوں ہی کی مدحتوں میں مگن رہا
ترے ﷺ دشمنوں نے ترے ﷺ چمن میں خزاں کا جال بچھا دیا

مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے ادب کی صورتیں

- ان دونوں مقدس شہروں کا تذکرہ اچھے انداز سے کیا جائے، ہم اردو میں علاقائی زبانوں میں شہروں کا امالہ کرتے ہیں جیسے ''میں کوئٹے گیا تھا'' تو جب ان شہروں کا امالہ کیا جاتا ہے تو نہ جانے کیوں بوجھل سا گزرتا ہے۔
- یہاں کے باسیوں کا بھی ادب و احترام کیا جائے۔ یہ ممکن ہے کہ وہاں کے باسیوں کے عقائد و افکار اور اعمال کردار میں فرق ہو مگر یہ سعادت تو انھیں ملی ہے کہ وہ ان مقدس شہروں کے باسی ہی نہیں بلکہ منتظم اور نگران بھی ہیں۔ کتنے امیر لوگ ہیں چاہتے بھی ہیں مگر ہر ایک کو یہ سعادت نصیب نہیں ہے!!
- حرمین شریفین دونوں کو ''حرم'' قرار دیا گیا ہے۔ مکہ مکرمہ کو سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اور مدینہ منورہ کو سردار انبیاء علیہ السلام نے۔ حدیث مبارکہ ہے:

((إِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ مَكَّةَ فَلَمْ تَحِلَّ لِأَحَدٍ قَبْلِي وَلَا تَحِلُّ لِأَحَدٍ بَعْدِي، وَإِنَّمَا أُحِلَّتْ لِي سَاعَةٌ مِنْ نَهَارٍ لَا يُخْتَلَى خَلَاهَا وَلَا يُعْضَدُ شَجَرُهَا وَلَا يُنَفَّرُ صَيْدُهَا وَلَا تُلْتَقَطُ لُقَطَتُهَا إِلَّا لِمُعَرِّفٍ)).

''بے شک اللہ نے مکہ کو حرمت والا قرار دیا (فتح مکہ کے موقع پر) میرے لیے دن کے کچھ حصے کے لیے حلال کیا گیا، مجھ سے پہلے اور بعد کسی کے لیے بھی حلال نہیں۔ نہ یہاں کانٹے دار پودوں کو کاٹا جائے نہ یہاں کے درخت

اکھیڑے جائیں، نہ یہاں کے شکار کو بھگایا جائے، نہ یہاں کی گری پڑی چیز کو اٹھایا جائے مگر وہ شخص اٹھا سکتا ہے جو اس کا اعلان کرے۔"[1]

اس حدیث کے راوی سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما ہیں ان کے شاگرد خاص سیدنا عکرمہ رضی اللہ عنہ اپنے شاگرد سے کہنے لگے: تمھیں: 'لَا يُنَفَّرُ صَيْدُهَا' کا مطلب پتا ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم وہاں کے شکار والے جانور کو سایہ دار جگہ سے ایک طرف کر دو اور خود وہاں بیٹھ جاؤ۔[2]

اسی طرح ایک اور حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کو بھی حرم قرار دیا۔ یہ حدیث سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی وساطت سے ہم تک پہنچی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إِنَّ إِبْرَاهِيمَ حَرَّمَ مَكَّةَ وَإِنِّي أُحَرِّمُ مَا بَيْنَ لَابَتَيْهَا)).

"بے شک ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرم قرار دیا تھا اور بے شک میں دونوں حروں کے درمیان (مدینہ منورہ کا جتنا ایریا ہے اس) کو حرم قرار دیتا ہوں۔"[3]

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ کی اسی حرمت کے پیش نظر فرمایا کرتے تھے:

((لَوْ رَأَيْتُ الظِّبَاءَ فِي الْمَدِينَةِ تَرْتَعُ مَا ذَعَرْتُهَا. قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صلی اللہ علیہ وسلم: مَا بَيْنَ لَابَتَيْهَا حَرَامٌ)).

"اگر میں مدینہ منورہ میں کسی ہرن کو بھی چرتا دیکھوں تو اس پر گھبراہٹ طاری نہیں کروں گا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ان دو حرّوں، یعنی سنگلاخ میدانوں کے درمیان جتنی جگہ ہے وہ حرم ہے۔"[4]

---

[1] صحيح البخاري، حديث:2090۔ [2] صحيح البخاري، حديث:2090۔ [3] صحيح البخاري، حديث:7333۔ [4] صحيح البخاري، حديث:1873۔

اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ جیسے حرم مکی کا ادب واحترام اور اس کی حرمت کی پاسداری ضروری ہے، اس طرح حرم مدنی کی عزت وتوقیر اورحرمت کی پاسداری بھی ضروری ہے۔ جب یہاں کے جانوروں اور جڑی بوٹیوں اور گر جانے والی چیزوں کا اس قدر احترام ہے کہ ان کے حقوق کا خیال رکھا جائے تو یہاں بسنے والے مسلمانوں کا عزت واحترام بھی یقینا ضروری ہوگا۔

احتیاط ضروری ہے

بعض لوگ مکہ اور مدینہ کی محبت اور ادب واحترام میں آ کر کچھ ایسے امور بھی شروع کر دیتے ہیں جو ناروا ہیں۔ مثلاً ایک جماعت کے سربراہ کے متعلق پتہ چلا کہ وہ مدینہ منورہ کی کھجور نہیں کھاتے کہ کھجور پیٹ میں جائے گی اور اس کے ہضم ہونے کے مراحل اور بعد کے مراحل میں اس کی توہین ہوگی۔ اسی طرح وہاں کی آج کل کی اشیا سے حد سے زیادہ پیار یا ادب واحترام بھی کئی فتنوں کا باعث بن سکتا ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ہمیں کتنے اچھے انداز سے یہ بات سمجھا دی ہے کہ ادب و احترام میں بھی اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم ملحوظ رکھی جائے۔ ایک دن سیدنا عمر رضی اللہ عنہ حجر اسود سے مخاطب ہوکر کہنے لگے:

((إِنِّي أَعْلَمُ أَنَّكَ حَجَرٌ لَا تَضُرُّ وَلَا تَنْفَعُ. وَلَوْلَا أَنِّي رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُقَبِّلُكَ مَا قَبَّلْتُكَ)).

"یقیناً میں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے۔ تو نفع دے سکتا ہے نہ نقصان۔ اگر میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تیرا بوسہ لیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو کبھی تیرا بوسہ نہ لیتا۔"[1]

[1] صحيح البخاري، حديث:1597.

صحیح احادیث کی روشنی میں حجر اسود جنت سے آیا ہوا ایک پتھر ہے۔ اس کے باوجود سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اس کے بارے میں مسلمانوں کو کیسا عمدہ اور اُجلا عقیدہ دے رہے ہیں۔

- اہل مدینہ کے خلاف کسی سازش کا حصہ نہ بنیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان بلکہ تنبیہ ہے:

((مَنْ أَرَادَ أَهْلَ الْمَدِينَةِ بِسُوءٍ أَذَابَهُ اللّٰهُ كَمَا يَذُوبُ الْمِلْحُ فِي الْمَاءِ)).

''جو بھی اہل مدینہ کے ساتھ کسی بھی برائی کا پلان کرے گا، اللہ اسے ایسے گھول دے گا جیسے نمک پانی میں گھل جاتا ہے۔''[1]

- مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے خلاف پروپیگنڈہ نہ کریں۔ اس طرح اغیار کو بھی ان کے خلاف ہرزہ سرائی کا موقع ملتا ہے۔

- اگر آج مسلمان بیت اللہ، مسجد نبوی اور بیت المقدس کے تقدس اور ادب و احترام کا بھرپور خیال رکھیں تو یقینا ہنود و یہود اور طاغوتی طاقتوں کو اس کی طرف میلی آنکھ سے دیکھنے کی بھی ہمت نہ رہے۔

ہماری مکہ و مدینہ سے محبت کا دعوی دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے جب ہم وہاں دوسرے کسی نظریے کے حامل افراد کے ہاتھوں انتظام و انصرام دیکھتے ہیں۔ حتی کہ وہاں جا کر بھی ان کے پیچھے نمازیں پڑھنے سے کتراتے ہیں۔ اگر بامر مجبوری پڑھنی پڑ جائیں تو بوجھل دل سے پڑھتے ہیں۔

3 بیت المقدس

انبیائے کرام علیہم السلام کی سرزمین شام و فلسطین ہیں۔ عہد نبوی کا شام، جس کے بہت

[1] صحيح مسلم، حديث:1387.

سے فضائل و مناقب ہیں، آج کے فلسطین، اردن، مقبوضہ بیت المقدس اور سعودی عرب کی سرحد تک کو محیط تھا۔ جیسے ہمیں انبیائے کرام علیہم السلام سے محبت ہے اسی طرح ان کے مولد و مسکن بھی ہمیں جان سے پیارے ہیں۔

بیت المقدس ہمارا قبلہ اول ہے۔ اسے سیدنا سلیمان علیہ السلام نے تعمیر کرایا اور ان کے صحیح نام لیوا آج صرف اور صرف مسلمان ہیں۔ مسلمانوں کے ہاتھوں اس کی فتح کی پیش گوئی بھی ہے۔ اور یہ پیش گوئی اغیار کے قبضے کو بھی مستلزم ہے۔ عیسائیوں نے یہودیوں کی مخالفت میں بیت المقدس کی توہین کرتے ہوئے وہاں کوڑا کرکٹ پھینک رکھا تھا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے جب بیت المقدس فتح کیا تو انھوں نے اپنے ہاتھوں سے وہ کوڑا کرکٹ اٹھا کر اس چیز کا اظہار کیا کہ ایک مومن کے دل میں اس کی بھی شان اور مقام ہے۔

مسجد اقصیٰ کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبردار کیا تھا کہ دشمن اس کے خلاف سازشیں کریں گے اور مسلمان اس سے محبت کا اظہار کرتے ہوئے بھی اس قدر بے بس ہو جائیں گے کہ اگر ایک مسلمان کے پاس زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا بھی ہوگا جہاں سے وہ مسجد اقصیٰ کو دیکھ سکے گا تو اسے وہ چھوٹا سا ٹکڑا پوری دنیا سے زیادہ محبوب ہو گا!! آیئے حدیث نبوی کا مطالعہ کریں۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس بات کا تذکرہ کیا کہ مسجد نبوی افضل ہے یا مسجد اقصیٰ؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((صَلَاةٌ فِي مَسْجِدِي أَفْضَلُ مِنْ أَرْبَعِ صَلَوَاتٍ فِيهِ، وَلَنِعْمَ الْمُصَلّٰى، وَلَيُوشِكَنَّ أَنْ يَّكُونَ لِلرَّجُلِ مِثْلُ شَطَنِ فَرَسِهِ مِنَ الْأَرْضِ حَيْثُ يَرٰى مِنْهُ بَيْتَ الْمَقْدِسِ خَيْرٌ لَّهُ مِنَ الدُّنْيَا

جَمِيعًا)).

"میری مسجد میں ایک نماز بیت المقدس میں چار (گنا) نمازوں سے افضل ہے اور وہ (بیت المقدس) بہت اچھی جائے نماز ہے اور بہت قریب ہے کہ ایک شخص کے پاس اپنے گھوڑے کی رسی کے بقدر زمین کا ٹکڑا ہو جہاں سے وہ بیت المقدس کو دیکھ سکتا ہو تو اس کے لیے یہ پوری دنیا سے بہتر ہوگا۔"[1]

ڈاکٹر اسحق زاہد لکھتے ہیں: "اس حدیث سے کئی باتیں معلوم ہوتی ہیں:

- صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تحویلِ قبلہ کے باوجود مسجد اقصیٰ کو بھولے نہیں اور وہ اپنی مجلسوں میں اس کا تذکرہ کیا کرتے تھے۔
- رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد اقصیٰ کی تعریف فرمائی اور اس میں پڑھی گئی ایک نماز کو مسجد نبوی میں پڑھی گئی ایک نماز کے چوتھے حصے کے برابر قرار دیا اور یہ بات معلوم ہے کہ مسجد نبوی میں ایک نماز پڑھنے سے ایک ہزار نمازوں کا ثواب ملتا ہے، تو گویا مسجد اقصیٰ کی ایک نماز 250 نمازوں کے برابر ہوئی۔
- اس حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ بیت المقدس کا مقام و مرتبہ مسلمانوں کے ذہنوں میں ہمیشہ زندہ رہے گا اور وہ اس سے کبھی دستبردار نہیں ہوں گے اور اس کے ساتھ ان کا شغف اس قدر زیادہ ہوگا کہ اگر بیت المقدس میں انھیں ایک چھوٹا سا قطعہ زمین بھی میسر آئے جہاں سے وہ مسجد اقصیٰ کو دیکھ سکیں تو وہ انھیں دنیا بھر کے مال و متاع کی بہ نسبت زیادہ محبوب ہوگا۔
- اس حدیث میں اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ مسجد اقصیٰ کی حفاظت

[1] المستدرك للحاكم، حديث: 509، وصححه ووافقه الذهبي وصححه الألباني في الصحيحة، حديث:2902.

کے سلسلے میں مسلمان آزمائشوں کا سامنا کریں گے۔ انھیں بیت المقدس سے نکال باہر کرنے کی سازشیں ہوں گی جبکہ انھیں بیت المقدس کا ایک ایک انچ دنیا ومافیھا سے زیادہ عزیز ہوگا...... اور آج بیت المقدس میں اور اس کے آس پاس جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس حدیث کی صداقت کے لیے کافی ہے۔''[1]

مذکورہ حدیث مبارکہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مسجد نبوی کے مقابلے بیت المقدس کو رکھنا اور آپ علیہ السلام کا اس حیثیت کو قبول کرنا بھی مسجد اقصیٰ کی قدر و منزلت کا ثبوت ہے۔

اس طرح اس حدیث میں میڈیا کے استعمال کی پیش گوئی کا اشارہ بھی ہے کیونکہ مسجد اقصیٰ سے دور کسی علاقے کا باسی تھوڑی جگہ لے یا زیادہ وہ تو اسے جدید آلات کے بغیر نہیں دیکھ سکتا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ میڈیائی جنگ میں بھی مسلمانوں کو مسجد اقصیٰ کا خوب ادب و احترام اور نام و مقام کا تذکرہ کرنا چاہیے۔ جیسے ہمارے ہاں مسجد حرام، مسجد نبوی کی تصاویر آویزاں کی جاتی ہیں اسی طرح مسجد اقصیٰ سے بھی ادب و احترام کا معاملہ کرنا چاہیے۔

علاوہ ازیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ثواب کی نیت سے تیاری کر کے سفر کرنے کی اجازت صرف انھی تین مقامات، یعنی مسجد حرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ کی طرف دی ہے۔

فرمان نبوی ہے:

((إِنَّمَا يُسَافَرُ إِلَى ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ: مَسْجِدِ الْكَعْبَةِ، وَمَسْجِدِي، وَمَسْجِدِ إِيلِيَاءَ)).

''(ثواب کی نیت سے) باقاعدہ سفر تو تین مساجد کی طرف کیا جا سکتا ہے: مسجد

[1] فضیلت بیت المقدس اور فلسطین و شام ص: 60-62 مطبوعہ دار السلام۔

کعبہ، میری مسجد اور مسجد ایلیا (اقصیٰ)۔" [1]

اور حسب ذیل حدیث میں ان تین مساجد کے سوا دیگر مقامات کی طرف ثواب کی نیت سے باقاعدہ سفر کرنے پر پابندی لگاتے ہوئے فرمایا:

((لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ إِلَّا إِلٰى ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ: مَسْجِدِي هٰذَا، وَمَسْجِدِ الْحَرَامِ، وَمَسْجِدِ الْأَقْصٰى)).

"تین مساجد کے علاوہ کہیں اور کا سفر اتنی تیاری سے ثواب کی نیت سے نہ کیا جائے: میری مسجد، مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ۔" [2]

ارشاد نبوی ﷺ ہے:

((صَلَاةٌ فِي مَسْجِدِي أَفْضَلُ مِنْ أَلْفِ صَلَاةٍ فِيمَا سِوَاهُ إِلَّا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ وَصَلَاةٌ فِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ أَفْضَلُ مِنْ مِّائَةِ أَلْفِ صَلَاةٍ فِيمَا سِوَاهُ)).

"میری مسجد میں نماز ادا کرنا باقی مساجد میں نماز ادا کرنے کی نسبت ہزار گنا زیادہ ہے۔ ہاں، مسجد حرام کا معاملہ الگ ہے۔ عام مساجد کی نسبت مسجد حرام میں نماز ادا کرنا ایک لاکھ گنا زیادہ ہے۔" [3]

حدیث مذکور میں مسجد نبوی کی نسبت مسجد حرام کی بہت نمایاں فضیلت بتائی گئی ہے، لہٰذا ادب و احترام اور مقام میں اولین حیثیت مسجد حرام ہی کو دینی چاہیے۔ اس کے بعد مسجد نبوی اور اس کے بعد مسجد اقصیٰ۔

---

[1] صحیح مسلم، حدیث: (513)-1397۔ [2] صحیح مسلم، حدیث: 1397۔ [3] سنن ابن ماجہ، حدیث: 1406.

اور مسجد اقصیٰ میں ایک نماز کا ثواب 250 نمازوں کے برابر ہے۔[1]

مسجد اقصیٰ کی پہچان میں دھوکا

یہاں یہ بات بھی قابل اصلاح ہے کہ عمومی طور پر لوگ قبۂ صخرہ (سنہرے گنبد والی عمارت) کو مسجد اقصیٰ سمجھ لیتے ہیں حالانکہ مسجد اقصیٰ اس سے علیحدہ ہے۔ اس کا گنبد سرمئی رنگ کا ہے۔ وہ اس عمارت کے مقابلے میں چھوٹی ہے۔ یہ سارے فضائل اسی مسجد اقصیٰ کے ہیں قبۂ صخرہ کے نہیں۔ یہ مسجد اقصیٰ کسی صلاح الدین ایوبی کی منتظر ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے یہود سے واگزار کرانے کی توفیق سے نوازے۔ آمین

الغرض! جیسے ہمارے محبوب پیغمبر علیہ السلام نے ان تینوں مقدس مقامات کا اکٹھا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح ہمیں بھی ان تینوں مقامات کو اہمیت دینی چاہیے، کیونکہ سابقہ انبیائے کرام علیہم السلام کے حقیقی وارث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہیں، جبکہ ہمارے ہاں بیت المقدس کا ذکر بہت کم ہوتا ہے۔

ان تینوں مقدس مقامات کا ادب و احترام از حد ضروری ہے۔ اور جو چیزیں ان کے ادب و احترام میں حائل ہوتی ہیں ان سے مکمل اجتناب اور کامل احتیاط ہمیں ان سے محبت و خلوص کی دولت سے مالا مال کر دے گی۔ ہمیں ان مقامات مقدسہ کے بارے میں مکمل معلومات اور نبوی پیش گوئیوں سے آگاہی ہونی چاہیے۔

ان تینوں مقامات کو جو ادب و احترام حاصل ہے وہ ان کے علاوہ کسی مقام یا آستانے کے لیے روا نہیں۔ کسی اور مقام کو ان جیسا مقام دینا یا ان مقامات کی زیارت کی طرح زیارت کرنا اور ثواب کی نیت سے سفر کرنا یا وہاں جا کر مخصوص عبادات کرنا

[1] المستدرک للحاکم، حدیث: 509.

شرعی طور پر نہ صرف غلط ہے بلکہ ان تینوں مقامات کے ادب کے بھی خلاف ہے۔

مساجد کا ادب و احترام

مسجد حرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ کی عزت و توقیر کا باب ادھورا شمار ہوگا جب تک ان کے ساتھ مساجد کے ادب و احترام کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مذکورہ مساجد میں شاید زندگی میں ایک دوبار یا خوش نصیبوں کو بار بار جانے کا موقع ملتا ہے بلکہ کئی تو وہیں نمازیں ادا کرتے ہیں۔ مگر ہماری عام مساجد اور ان کے ادب و احترام کی ناگفتہ بہ حالت پر بھی بات کرنا ضروری ہے کیونکہ شب و روز کم وبیش پانچ بار ان سے ایک مسلمان کا واسطہ پڑتا ہے۔

مساجد کی اہمیت وفضیلت

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

((أَحَبُّ الْبِلَادِ إِلَى اللّٰهِ مَسَاجِدُهَا وَأَبْغَضُ الْبِلَادِ إِلَى اللّٰهِ أَسْوَاقُهَا)).

”اللہ کے ہاں بہترین قطع زمین روئے زمین کی مساجد ہیں اور اس کے ناپسندیدہ مقامات بازار ہیں۔“[1]

اللہ تعالیٰ کے ہاں مسجد کی طرف چل کر آنے والے کی بڑی قدر ہے۔ مسجد کی طرف چل کر جانے والے نمازی کے قدم اٹھانے اور رکھنے پر ایک گناہ معاف اور ایک درجہ بلند ہوتا ہے۔[2]

[1] صحیح مسلم، حدیث:671۔ [2] صحیح مسلم، حدیث:666.

مساجد کے ادب و احترام کی صورتیں

1 مسجدوں کو پاک صاف رکھا جائے: سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: رسول اللہ ﷺ نے محلوں میں مسجدوں کی تعمیر کا اور انھیں پاک صاف رکھنے کا اور انھیں خوشبو دار کرنے کا حکم فرمایا ہے۔[1]

نبی ﷺ نے زیادہ تر گھر ہی سے طہارت، نظافت اور وضو کر کے مسجد آنے کی ترغیب دی ہے۔ اس سے اشارہ ملتا ہے کہ آپ ﷺ کے عہد میں لوگ گھروں ہی سے وضو کر کے آتے تھے۔ لیکن اگر آج ضرورت کے تحت ٹائلٹ وغیرہ مسجد کے ایریے میں بنا لیے گئے ہیں تو ان کی صفائی کا خاص خیال رکھا جائے۔ دراصل یہ مسلمانوں کی عبادت گاہ ہے اور مسجد سے ان کے تعلق کا ثبوت ہے۔

2 مسجدوں میں اللہ کا ذکر کیا جائے: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فِي بُيُوتٍ أَذِنَ اللّٰهُ أَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ﴾

”ان عظیم گھروں میں جن کی بابت اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ انھیں بلند کیا جائے اور ان میں اسی کا نام لیا جائے۔“[2]

3 مسجدیں جس مقصد کے لیے بنی ہیں اسی کے لیے خاص رکھا جائے: فرمان نبوی ہے:

((مَنْ سَمِعَ رَجُلًا يَنْشُدُ ضَالَّةً فِي الْمَسْجِدِ فَلْيَقُلْ لَا رَدَّهَا اللّٰهُ عَلَيْكَ فَإِنَّ الْمَسَاجِدَ لَمْ تُبْنَ لِهٰذَا)).

”جو مسجد میں کسی شخص کو گم شدہ چیز کا اعلان کرتے سنے اسے یہ کہنا چاہیے کہ اللہ کرے وہ تجھے نہ ملے کیونکہ مساجد ان گمشدہ چیزوں کے اعلانات کے لیے

---

[1] سنن أبي داود، حديث:455. [2] النور 24:36.

نہیں بنائی گئیں۔''[1]

اس روایت کا واضح مفہوم ہے کہ مسجدیں جس مقصد کے لیے تعمیر کی جاتی ہیں وہی مقصد ان میں پورا کرنا چاہیے۔

4 مسجد میں گمشدہ چیزوں کا اعلان نہ کیا جائے: اس کی دلیل ابھی گزری ہے۔ اور یہ اس لیے ہے کہ اگر ایسے اعلان ہوتے رہیں تو مساجد کا وہ مقام انسان کے ذہن میں نہیں رہتا۔ اگر کسی دیہات میں مسجد سے کسی کی گم شدہ مرغی کا اعلان ہو اور کسی کی بکری کا اعلان ہو تو آپ خود غور کریں اس مسجد کے نمازی اس مسجد کا کیا مقام اور ہیبت لے کر مسجد آئیں گے؟

نہ ملنے والے بچوں کا مسجد میں اعلان

باقی رہا مساجد میں گم شدہ بچوں کا اعلان! اس بارے میں میرا نقطہ نظر کچھ یوں ہے کہ ایک تو یہ کہ بچے آئے روز گم بھی نہیں ہوتے۔ بہت نادر ہی ایسے واقعات ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ گمشدہ شخص یا بچے/ بچی پر ''ضالۃ'' کا اطلاق نہیں ہوتا جس کی ممانعت حدیث میں آئی ہے۔ تیسرے یہ کہ مساجد کے سپیکر اونچے لگے ہوتے ہیں اور آواز دور دور تک فوراً چلی جاتی ہے۔ اگر کوئی گم شدہ بچے کو اعلان میں بیان کردہ حلیے میں دیکھ لیتا ہے تو اس طرح اسے اغوا ہونے سے بچایا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ہے کہ ایک مسلمان کی حرمت بہرحال بہت زیادہ ہے۔ اس سے مسجد کی بے توقیری کا تصور ابھرنے کے خدشات نہیں ہو سکتے...... یہ نعوذ باللہ حدیث کی مخالفت نہیں بلکہ ایک ضرورت اور دور حاضر کا ایک جدید مسئلہ سمجھ کر بات کی ہے۔ اگر

[1] صحیح مسلم، حدیث:1288.

درست معلوم ہوتی ہے تو مان لیا جائے وگرنہ اسے پرکاہ کی حیثیت بھی نہ دیں۔

5 مسجدوں میں خرید وفروخت نہ کی جائے: حدیث مبارکہ ہے:

((إِذَا رَأَيْتُمْ مَنْ يَبِيعُ أَوْ يَبْتَاعُ فِي الْمَسْجِدِ فَقُولُوا: لَا أَرْبَحَ اللّٰهُ تِجَارَتَكَ)).

”جب تم کسی کو دیکھو وہ مسجد میں خرید وفروخت کر رہا ہے تو اس سے کہو اللہ تعالیٰ تمھاری تجارت کو تمھارے لیے سودمند نہ بنائے۔“[1]

اس میں جہاں بیچنے والے کے لیے وعید ہے وہاں خریدنے والے کو بھی تنبیہ ہے کہ اس کی خریداری باعث برکت نہیں ہوگی۔

اگر مسجد میں کسی کو دینی کتب یا رسائل کی خرید وفروخت کی اجازت دی جائے یہ سمجھ کر کہ یہ دینی کام ہے تو دینی کتاب لینے دینے میں تکرار اور جھگڑے کا چانس موجود ہے جو ممانعت کی اصل وجہ ہے۔ اس لیے اس سے بھی احتراز چاہیے۔

6 مسجدوں پر فخر نہ کیا جائے: نبی ﷺ کا فرمان ہے:

((لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتّٰى يَتَبَاهَى النَّاسُ فِي الْمَسَاجِدِ)).

”اس وقت تک قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک لوگ اپنی مساجد پر فخر نہیں کرنے لگ جائیں گے۔“[2]

7 مسجدوں کے ذریعے مسلمانوں میں تفرقہ نہ ڈالا جائے: مسجد کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ یہاں کا کوئی عمل یا یہاں کی کوئی تعلیم مسلمانوں کے درمیان تفریق ڈالنے کے لیے نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے مسجد ضرار سے منافقین کے ممکنہ اہداف کی بابت فرمایا ہے:

---

[1] جامع الترمذي، حديث:1336۔ [2] سنن أبي داود، حديث:449 صحيح.

﴿وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّ تَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾

''وہ لوگ جنھوں نے مسجد بنائی ضرر رسانی کے لیے، کفر کے لیے اور مومنوں میں تفریق ڈالنے کے لیے......۔''[1]

یعنی یہ منافقین کا کام ہے اور اہل ایمان کی سوچ اس سے بلند تر ہونی چاہیے۔

8 مسجد میں بدبودار چیزیں کھا پی کر نہ آیا جائے: ارشاد نبوی ﷺ ہے:

((مَنْ أَكَلَ مِنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ فَلَا يَأْتِيَنَّ الْمَسَاجِدَ)).

''جو کوئی لہسن وغیرہ کھائے تو پھر مساجد میں ہرگز نہ آئے۔''[2]

اس بارے میں بہت سی احادیث ہیں جن کا لب لباب یہی ہے کہ کسی بھی بدبودار چیز کو استعمال کر کے مسجد میں آنے سے پرہیز کیا جائے۔ حقہ اور سگریٹ وغیرہ تو ویسے ہی شرعی نقطۂ نظر سے ممنوع ہے ان کو تو استعمال ہی نہیں کرنا چاہیے۔ چہ جائیکہ کوئی شخص انھیں بھی استعمال کرے اور مساجد میں بھی آئے۔ یہ کہہ کر انھیں مساجد سے نہیں روکا جارہا بلکہ حقہ اور سگریٹ کے استعمال سے روکا جارہا ہے۔ اسی طرح بعض لوگ اپنے پسند کی تیز خوشبو لگا آتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ یہ تیزی دوسروں کے لیے تکلیف کا باعث بن جاتی ہے۔

9 مسجد میں تھوکا نہ جائے: رسول اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

((اَلْبُزَاقُ فِي الْمَسْجِدِ خَطِيئَةٌ وَكَفَّارَتُهَا دَفْنُهَا)).

''مسجد میں تھوکنا گناہ ہے اور اس کا کفارہ تھوک کو دفن کر دینا ہے۔''[3]

---

(1) التوبة9:107۔ (2) صحیح مسلم، حدیث:561۔ (3) صحیح البخاري، حدیث:415.

جہاں مسجد کا فرش کچا ہو وہاں دفن کیا جا سکتا ہے اور دیگر صورت حال میں دھو کر اور صاف کر کے عہدہ برآ ہوا جا سکتا ہے۔

10 مسجد میں آواز بلند نہ کی جائے: نبی ﷺ مسجد میں اعتکاف بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ نے لوگوں کو بلند آواز سے تلاوت کرتے سنا تو آپ نے پردہ ہٹایا اور فرمایا:

((أَلَا إِنَّ كُلَّكُمْ مُنَاجٍ رَبَّهُ فَلَا يُؤْذِيَنَّ بَعْضُكُمْ بَعْضًا وَلَا يَرْفَعْ بَعْضُكُمْ عَلَى بَعْضٍ فِي الْقِرَاءَةِ)).

''خبردار! بے شک تم میں سے ہر شخص اپنے رب سے مناجات اور سرگوشیاں کرتا ہے، لہٰذا تم ایک دوسرے کو ڈسٹرب نہ کیا کرو اور نہ تلاوت کرنے میں ایک دوسرے سے آواز بلند کیا کرو۔''[1]

......تلاوت کرنے میں مسجد کا یہ ادب سکھایا جا رہا ہے تو خود ہی بتائیے! نماز پڑھنے والوں کے پہلو میں بیٹھ کر گپ شپ اور قہقہے اور لڑائیاں جھگڑے مسجد میں کیونکر روا ہو سکتے ہیں۔[2]

---

[1] سنن أبي داود، حدیث: 1332۔ صحیح۔ [2] راقم نے اپنی کتاب کا مسودہ مکمل کر لیا تھا۔ ان دنوں حافظ عزیز الرحمن اعوان حفظہ اللہ (مرکزی عیدگاہ گھوڑے شاہ، گوجرانوالہ) سے ملاقات ہوئی۔ میں نے مسودے کی تکمیل کا بتایا۔ تو وہ کہنے لگے کہ آپ دو کتابوں سے ضرور استفادہ کریں۔ ایک پیر ذوالفقار نقشبندی حفظہ اللہ کی کتاب: ''باادب بانصیب'' اور ایک سید ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ کی کتاب ''ادب پہلا قرینہ ہے'' پہلی کتاب تو ان سے کوئی لے گیا تھا دوسری کتاب مل گئی۔ یہ کتاب والد گرامی رحمہ اللہ کی اس میز پر بھی تھی جس پر کام کرتے ہوئے ان کی وفات ہوئی تھی۔ بہرحال کتاب کے مندرجات کو دیکھا تو اپنے عنوانات سے ایک مزید عنوان ''مساجد کا ادب'' نظر آیا، لہٰذا زیر نظر کتاب میں بھی یہ عنوان شامل کیا گیا اور ''مسجد جاتے ہوئے دل پر ہیبت ......'' والا آمدہ عنوان انھی کے الفاظ میں اپنی اس کتاب میں شامل کیا جا رہا ہے۔ جزاہ اللہ عنا خیر الجزاء۔

مسجد جاتے ہوئے دل پر ہیبت اور ادب طاری کرے

سورۃ البقرہ میں ہے:

﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيهَا اسْمُهٗ وَ سَعٰى فِيْ خَرَابِهَا اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَا اِلَّا خَآئِفِيْنَ. لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾

''اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو گا جو اللہ کی مسجدوں میں اس بات سے روکے کہ اس کا نام لیا جائے۔ اور اس کی عبادت کی جائے اور ان کو ویران کرنے کے درپے ہو۔ ان کو تو بے ہیبت ہو کر مسجد میں قدم بھی نہ رکھنا چاہیے تھا اور ان کے لیے زیبا یہی تھا کہ اللہ سے ڈرتے ہوئے مساجد میں داخل ہوتے۔ ان کے لیے دنیا میں بھی رسوائی ہے اور آخرت میں تو بڑا عذاب ہوگا۔''[1]

اس آیت کے شان نزول میں اختلاف ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ جب یہودیوں نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو قتل کر ڈالا تو روم کے نصاریٰ نے ان سے انتقام لینے کی خاطر عراق کے ایک مجوسی بادشاہ کے ساتھ مل کر اپنے بادشاہ طیطوس کی سرکردگی میں شام کے یہودیوں پر حملہ کیا اور قتل و غارت کا بازار گرم کیا۔ تورات کے نسخے جلا ڈالے۔ بیت المقدس کی بے حرمتی کی۔ اس میں نجاستیں ڈالیں۔ اور خنزیر لا کر اس میں باندھے۔ اس کی عمارت کو ویران کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک بیت المقدس اسی طرح ویران اور برباد پڑا تھا۔ رومی عیسائیوں کی ان گستاخیوں اور بداعمالیوں پر اس آیت میں ناراضگی کا اظہار کیا گیا ہے۔

① البقرۃ:2:114.

حضرت ابن زید رضی اللہ عنہ اور بعض دوسرے مفسرین کا خیال یہ ہے کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب مشرکین مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو واقعہ حدیبیہ میں مسجد حرام میں داخل ہونے اور طواف کرنے سے روک دیا تھا۔

ابن جریر رحمہ اللہ نے پہلی روایت کو اور ابن کثیر رحمہ اللہ نے دوسری روایت کو ترجیح دی ہے۔

اس آیت کا شان نزول چاہے کچھ ہو، اس آیت کے الفاظ میں عمومیت ہے اور ایک عام قاعدہ اور ضابطہ بیان فرما دیا۔ اس آیت میں بیت المقدس یا بیت اللہ کا نام نہیں لیا، مساجد اللہ، کہا تا کہ تمام مسجدوں پر اس حکم کا اطلاق ہو جائے۔ پس آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ جو شخص کسی مسجد میں لوگوں کو اللہ کا ذکر کرنے سے روکے یا کوئی ایسا کام کرے جس سے مسجد ویران ہو جائے، تو وہ بہت بڑا ظالم ہے۔

اللہ کی مسجدوں کی حرمت کا تقاضا یہ ہے کہ جو شخص ان میں داخل ہو، اس پر اللہ کی عظمت اور ہیبت طاری ہو اور خشوع و خضوع کے ساتھ داخل ہو۔ یہ اس بادشاہوں کے بادشاہ، اس رب السمٰوات والارض کے دربار کی حاضری ہے۔

اس آیت سے یہ بات واضح ہوئی کہ آداب ملحوظ رکھنے کے اعتبار سے دنیا کی ساری مسجدیں برابر ہیں۔ جیسے بیت المقدس، مسجد حرام یا مسجد نبوی کی بے حرمتی ظلم عظیم ہے اسی طرح مساجد میں سے ہر مسجد کی بے حرمتی ظلم عظیم ہے۔

اس آیت سے دوسری بات یہ واضح ہوتی ہے کہ مسجد میں ذکر اور نماز سے روکنے کی جتنی بھی صورتیں ہیں سب ناجائز اور حرام ہیں۔ ہر ایک شخص پر اس آیت کا اطلاق ہوتا ہے جو کسی کو مسجد میں جانے سے یا وہاں نماز، ذکر اور تلاوت سے صراحتاً روکتا ہے یا مسجد میں شور و شغب کر کے لوگوں کی عبادت میں خلل ڈالتا ہے۔ اس آیت سے یہ بات بھی

واضح ہوئی کہ مسجد کو ویران اور برباد کرنا بڑے ظلم کی بات ہے اوراس کی سب صورتیں حرام ہیں۔تخریب ظاہری ہو یا معنوی ہو۔ مساجد کی بے حرمتی کرنا اوران کومنہدم کرنا ظاہری تخریب ہے اورمساجد میں اللہ کے ذکر کی بجائے دنیا کی باتیں کرنا یا شوروشغب کرنا یا ایسے اسباب پیدا کرنا کہ نمازی مسجد سے بھاگنے لگیں،تخریب معنوی ہے۔ وہ شخص بھی وَسعی فی خرابھا میں داخل ہے جس کی بدمزاجی سے تنگ آ کر لوگ مسجد میں آنا چھوڑ دیں۔ مسجد کی آبادی در و دیوار کے نقش و نگار سے نہیں، بلکہ اللہ کا ذکر کرنے والوں سے ہے اوران کے اخلاص سے ہے اوران انوار سے ہے جوان ذکر کرنے والوں پر برستے ہیں۔ اسی لیے ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللّٰهِ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْآخِرِ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَی الزَّكٰوةَ وَلَمْ یَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ﴾

”مسجدوں کی آبادی تو بس ان لوگوں سے ہے جو اللہ پر ایمان لائیں اورآخرت کے دن پر اور نماز قائم کریں، زکوۃ ادا کریں اوراللہ کے سوا کسی سے نہ ڈریں۔“

حدیث شریف میں قربِ قیامت کی یہ علامت بھی بیان کی گئی ہے:

((مَسَاجِدُ هُمْ عَامِرَةٌ وَهِيَ خَرَابٌ))

”مسجدیں ان کی یوں تو آباد ہوں گی مگر حقیقتاً ویران ہوں گی۔“[1]

یعنی مسجدوں کی عمارتیں تو عالی شان ہوں گی۔ درودیوار منقش ہوں گے۔ ظاہری رونق بھی ہوگی مگر ریاکاری اور نام ونمود کی وجہ سے اورللّٰہیت اور خلوص کی کمی کی وجہ

---

[1] سلسلة الأحاديث الضعيفة:4/410،حديث:1936 ”ضعيف“.

سے ویران ہوں گی۔

پس مسجد میں جاتے ہوئے اللہ کی ہیبت اور ادب دل پر طاری ہونا چاہیے کہ یہ اللہ کے دربار کی حاضری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نماز میں شامل ہونے کے لیے بھاگتے ہوئے مسجد کی طرف جانا ممنوع قرار دیا گیا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے ہوئے سنا ہے:

((إِذَا أُقِيمَتِ الصَّلٰوةُ فَلَا تَأْتُوهَا تَسْعَوْنَ وَأْتُوهَا تَمْشُونَ وَ عَلَيْكُمُ السَّكِينَةُ فَمَا أَدْرَكْتُمْ فَصَلُّوا وَمَا فَاتَكُمْ فَأَتِمُّوا)).

''اگر نماز کھڑی ہو جائے تو دوڑتے ہوئے مت آؤ۔ سکون اور وقار کے ساتھ چلتے ہوئے آؤ۔ جتنی رکعتیں مل جائیں باجماعت پڑھ لو اور جو رکعتیں رہ جائیں وہ خود پوری کر لو۔'' [1] (مولانا سید ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ کی عبارت ختم ہوئی)۔

اللہ تعالیٰ ہمیں مسجد حرام، مسجد نبوی، مسجد اقصیٰ اور دیگر مساجد کا ادب و احترام کرنے اور انھیں ان کا مقام دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

[1] سنن أبي داود، حديث:572.

باب: 7

اہلِ بیت اطہار رضی اللہ عنہم کا ادب واحترام

اہلِ بیت رضی اللہ عنہم کے ادب واحترام اور فضائل ومناقب سے قبل یہ جاننا ضروری ہے کہ اہلِ بیت سے مراد کون ہیں۔

اہلِ بیت رضی اللہ عنہم اور آلِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کون ہیں؟

آلِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ گھر والے مراد ہیں جن پر صدقہ حرام ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ایک دفعہ سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہما نے صدقے کی کھجوروں میں سے ایک کھجور منہ میں ڈال لی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں دیکھ لیا تو وہ کھجور ان کے منہ سے نکلوائی اور فرمایا:

((أَمَا عَلِمْتَ أَنَّ آلَ مُحَمَّدٍ صلی اللہ علیہ وسلم لَا يَأْكُلُونَ الصَّدَقَةَ؟)).

''کیا تمھیں پتا نہیں کہ آلِ محمد صدقہ نہیں کھاتے۔''[1]

آلِ رسول اور اہلِ بیت کے دیگر اطلاقات

آل کا لفظ پیروکاروں پر بھی بولا جاتا ہے جیسا کہ فرعون کی بابت قرآن مجید میں ہے:

﴿اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ

[1] صحيح البخاري، حديث:1485.

﴿اَدْخِلُوا آلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ﴾

''وہ صبح و شام آگ پر پیش کیے جاتے ہیں اور جس دن قیامت قائم ہوگی (تو حکم ہوگا کہ) آل فرعون کو سخت ترین عذاب میں داخل کر دو۔'' [1]

اسی طرح ازواج بھی آل میں شامل ہوتی ہیں۔ عام درود میں اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَ عَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ کا ذکر ہے مگر ''آل'' کی وضاحت ایک ثابت شدہ درود میں اس طرح ہے:

((اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَأَزْوَاجِهٖ وَذُرِّيَّتِهٖ)).

''اے اللہ! محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کی ازواج مطہرات پر اور ان کی اولاد پر رحمت بھیج۔'' [2]

یاد رہے ''آل'' کا لفظ ''اہل'' ہی سے ماخوذ ہے کیونکہ ''آل'' کی تصغیر ''أهيل'' ہے اور تصغیر میں اصلی حروف سامنے آ جاتے ہیں۔ مگر ''آل'' اور ''اہل'' کے اطلاقات مختلف ہوتے رہتے ہیں جیسا کہ قرآنِ مجید کے اکثر مقامات میں اهل البيت کا لفظ ازواج کے لیے استعمال ہوا ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی اہلیہ کے متعلق فرمایا:

﴿رَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الْبَيْتِ﴾

''اے اہل بیت (گھر والو)! تم پر اللہ کی رحمت اور سلامتی ہو۔'' [3]

اسی طرح حدیث میں بھی اہل بیت کا لفظ زوجہ محترمہ کے لیے بولا گیا ہے۔ جب ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] المؤمن 40:46۔ [2] صحيح البخاري، حديث:3369، و صحيح مسلم، حديث:407۔
[3] هود 11:73.

((مَنْ يَّعْذِرُنِي فِي رَجُلٍ بَلَغَنِي أَذَاهُ فِي أَهْلِ بَيْتِي؟))

"کون مجھے سپورٹ کرے گا اس (منافق) کے مقابلے میں جس نے میری بیوی پر تہمت لگائی ہے۔"[1]

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ام المومنین زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کی رخصتی کے بعد سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے کی طرف تشریف لائے تو فرمایا:

((اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الْبَيْتِ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ)).

اور بعض دیگر ازواج مطہرات کے پاس جا کر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی فرمایا۔[2]

آیت تطہیر اور اہل بیت رضی اللہ عنہم

آیت تطہیر کا سیاق و سباق بھی ازواج مطہرات سے متعلق ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُولٰى وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَآتِينَ الزَّكَاةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُولَهٗ اِنَّمَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا ○ وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيفًا خَبِيرًا ○﴾

"اور تم اپنے گھروں میں ٹک کر رہو، اور گزشتہ دورِ جاہلیت کی زیب و زینت کی

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 2637، وصحيح مسلم، حديث: 2270۔ [2] صحيح البخاري، حديث: 4793.

نمائش کی مانند (اپنی) زیب و زینت کی نمائش نہ کرنا اور نماز قائم کرو اور زکاۃ دو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اے اہل بیت! بس اللہ تو چاہتا ہے کہ وہ تم سے ناپاکی دور کردے اور تمھیں بالکل پاک صاف کردے۔ اور تمھارے گھروں میں جو اللہ کی آیات اور سنت (کی باتیں) پڑھی جاتی ہیں وہ یاد کرو، یقیناً اللہ نہایت باریک بین، خوب باخبر ہے۔''[1]

ان نصوص سے واضح ہوتا ہے کہ اہل بیت کا لفظ قرآن و حدیث میں ازواج کے لیے استعمال ہوا ہے۔

اس سلسلے میں ایک اہم بحث یہ ہے کہ آیت تطہیر میں ''اہل البیت'' سے مراد کون ہیں اور تطہیر سے کیا مراد ہے؟

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ سورہ احزاب کی 30 سے 33 تک آیات ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں: ''یہ فضیلت و منفعت محض ازواج مطہرات کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ جملہ اہل بیت رضی اللہ عنہم کو شامل ہے۔ اور سیدنا علی، فاطمہ، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم کو دوسرے اہل بیت کی نسبت خصوصیت حاصل ہے، اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے خصوصی طور پر دعا فرمائی۔ اس کی مثال اسی طرح ہے جس طرح فرمانِ الٰہی ہے:

﴿لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ﴾

''البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد روزِ اول ہی سے تقوے پر رکھی گئی ہے۔''[2]

اس کا نزول تو مسجد قباء سے متعلق ہے لیکن یہ حکم اسے بھی اور جو اس سے بھی زیادہ اس اعزاز کی مستحق مسجد ہے اسے بھی شامل ہے اور وہ مسجد نبوی ہے۔[3]

[1] الأحزاب33:33، 34۔ [2] التوبة9:108۔ [3] منهاج السنة النبوية:4/48.

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ پہلے آیت کا نزول ہوا اور بعد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا سیدنا حسنین کریمین اور سیدنا علی رضی اللہ عنہم کے لیے دعا کی۔ اگر یہ پہلے ہی اس آیت سے مراد ہوتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں تھی کہ یہ میرے اہل بیت ہیں، لہٰذا ان کی تطہیر فرما دے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تو پہلے تطہیر کے ارادے کا اظہار فرمایا تھا اور اللہ تعالیٰ کو اس کا بھی علم ہے کہ اہل بیت کون ہوتے ہیں، لہٰذا سیدہ ام سلمہ اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہما کی روایت کردہ حسب ذیل حدیث کِسَاء سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا علی، فاطمہ اور حسنین کریمین رضی اللہ عنہم کو بھی آیت تطہیر میں بیان کردہ اعزاز میں شریک کرنے کے لیے یہ دعا کی تھی، جبکہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن تو شامل ہی تھیں۔

حدیث کِساء

سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا حسن، حسین، علی اور فاطمہ رضی اللہ عنہم پر ایک بڑی چادر ڈالی پھر فرمایا:

((اَللّٰهُمَّ! هٰؤُلَاءِ أَهْلُ بَيْتِي وَحَامَتِي أَذْهِبْ عَنْهُمُ الرِّجْسَ وَطَهِّرْهُمْ تَطْهِيرًا)).

”اے اللہ! یہ میرے اہل بیت اور میرے قریبی ہیں تو ان سے پلیدی کو دور کر دے اور انھیں مکمل طور پر پاک صاف کر دے۔“

سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں بھی ان کے ساتھ ہو جاؤں؟ فرمایا:

((إِنَّكِ عَلٰى خَيْرٍ)).

''یقیناً تو خیر ہی پر ہے۔''[1]

محب الدین الطبری فرماتے ہیں: یہ حدیث ازواج مطہرات کو اہل بیت میں شامل کرنے میں رکاوٹ نہیں کیونکہ اگر کوئی شخص اپنے کچھ بچوں کی طرف اشارہ کر کے کہے کہ یہ میرے بچے ہیں اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کے علاوہ اس کے اور بچے نہ ہوں، نیز یہ بھی ممکن ہے کہ اس حدیث سے اس وہم کا دفاع کرنا بھی مقصود ہو کہ آپ ﷺ کی صاحبزادی سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا اور ان کی اولاد آپ ﷺ کے اہل بیت میں سے نہیں۔[2]

ایک اور پہلو یہ بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ کی خواہش ہوتی تھی کہ کسی کو اس کے استحقاق سے محروم نہ کیا جائے۔ آپ ﷺ نے اس شخص کو ڈانٹ پلائی تھی جس نے یہ دعا کی تھی: ''اے اللہ! صرف مجھ پر اور محمد ﷺ پر رحم فرما اور ہمارے ساتھ کسی کو اس رحمت میں شریک نہ فرما۔''

چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((لَقَدْ حَجَّرْتَ وَاسِعًا)).

''یقیناً تو نے اللہ تعالیٰ کی وسیع رحمت کو محدود کر دیا ہے۔''[3]

اسی طرح ایسے امام کے لیے بھی وعید ہے جو دعا میں مقتدیوں کو بھلا دیتا ہے۔ فرمانِ نبوی ہے:

((لَا يَؤُمُّ عَبْدٌ فَيَخُصَّ نَفْسَهُ بِدَعْوَةٍ دُونَهُمْ فَإِنْ فَعَلَ فَقَدْ

[1] جامع الترمذي، حديث:3871۔ [2] السمط الثمين في مناقب أمهات المؤمنين، ص:21۔
[3] صحيح البخاري، حديث:6010.

خَانَهُمْ)).

''کوئی شخص نماز پڑھائے تو نمازیوں کو چھوڑ کر صرف اپنے لیے دعا نہ کرے۔ اگر اس نے ایسا کیا تو ان کے ساتھ خیانت کی۔''[1]

اس رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے اس مقام کو لینے میں حائل ہو جائیں جس کی وہ خواہاں تھیں۔ بنابریں روایت مذکورہ کا یہی مطلب ہے کہ تیرے پاس یہ بھلائی پہلے سے موجود ہے۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے ہاں تھے اور آپ کے قریب آپ کے نواسی، نواسوں میں سے صرف حسنین کریمین ہی رہتے تھے، اسی لیے وہی آپ کے پاس آئے اور بعض روایات میں ہے کہ آپ نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ اپنے خاوند سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا حسنین کریمین رضی اللہ عنہما کو بلا لاؤ۔

تطہیر سے مراد: اگر یہ آیت ائمہ کی معصومیت اور ان کی تعیین کی دلیل ہوتی تو سب سے پہلا امام سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کو ہونا چاہیے تھا۔ ان کو کس فرمان کے تحت اس سے نکالا جا سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر صرف انھی چار شخصیات کی تطہیر ہوئی ہے تو ان کی نسلوں کی تطہیر کی دلیل کیا ہے اور اگر سب کی نسلوں کی تطہیر ہوئی ہے تو پھر سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی نسل ہی کو یہ اعزاز کیوں ملا۔ اور پھر یہ اعزاز صرف 12 آئمہ تک محدود کس حدیث یا آیت کے پیش نظر ہوا۔

یہ بات بھی ہے کہ قرآن مجید اور حدیث مبارکہ میں آنے والے ایسے فرامین اور مواقع ایک آزمائش ہوتے ہیں۔ فرمانِ الٰہی ہے:

[1] سنن ابن ماجہ، حدیث:923 ''ضعیف''۔

﴿فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَاْوِيْلِهٖ﴾

''ہاں! جن کے دلوں میں کجی ہے وہ فتنہ پردازی اور مفہوم بدلنے کے لیے ان آیات کے پیچھے پڑتے ہیں جو متشابہ ہوتی ہیں۔''[1]

وہ فرقے جو دین سے اس طرح نکل چکے ہیں جس طرح تیر شکار میں سے آر پار ہو جاتا ہے، وہ بھی آیات واحادیث ہی کا سہارا لیتے ہیں۔ اگر سب کچھ بالکل واضح ہوتا تو ان باطل نظریات کے حاملین کا امتحان کیسے ہوتا!!!

بالفرض آیت تطہیر سے مراد محض سیدنا علی، سیدہ فاطمہ اور سیدین حسنین کریمین رضی اللہ عنہم ہی ہوں تو پھر ان کے بارے میں معصومیت کا عقیدہ درست نہیں کیونکہ اس آیت میں تو کہا گیا ہے کہ ''اللہ ارادہ کرتا ہے کہ ان سے رجس دور کر دے۔'' جبکہ انھیں گناہوں سے پاک صاف جاننے والے انھیں پہلے دن ہی سے معصوم قرار دیتے ہیں۔

پھر محض سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی اولاد کو یہ مقام کیوں دیا گیا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے اور بھی بیٹے تھے، بعد ازاں سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی اولاد کو یہ مقام کیوں حاصل نہیں۔ اسی طرح سیدنا عباس، سیدنا جعفر اور سیدنا عقیل رضی اللہ عنہم کی اولاد کیوں اہل بیت میں سے نہیں اور ان کے یہ مناقب کیوں نہیں؟

مطلق طور پر اہل بیت یا آل رسول کا لفظ آئے تو: اب سوال یہ ہے کہ عمومی طور پر اہل بیت کا لفظ آئے تو اس سے کیا مراد ہوگا۔ سیدنا زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کی وضاحت کے مطابق اہل بیت وہی ہیں جن پر صدقہ حرام ہے۔ ان کی اس روایت کو امام مسلم رحمہ اللہ

[1] آل عمران 3:7.

نے ان الفاظ سے بیان کیا ہے کہ حصین بن سبرہ نے زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ اہل بیت سے کون مراد ہیں؟ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج اہل بیت میں سے نہیں؟ انھوں نے جواب دیا: ہاں وہ تو اہل بیت میں سے ہیں لیکن آپ کے (اصل) اہل بیت وہ ہیں جن پر صدقہ حرام ہے۔ حصین کہنے لگے: جن پر صدقہ حرام ہے وہ کون کون ہیں؟ زید رضی اللہ عنہ فرمانے لگے: وہ آل علی، آل عقیل، آل جعفر، آل عباس رضی اللہ عنہم ہیں۔ حصین بن سبرہ نے پھر پوچھا: ان سب پر صدقہ حرام ہے۔ فرمایا: ہاں۔[1]

ایک دوسری روایت میں زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ ہیں: ازواج مطہرات اہل بیت میں سے نہیں......! اللہ کی قسم! عورت تو آدمی کے ساتھ ایک عرصہ تک رہتی ہے، پھر وہ بسا اوقات اسے طلاق بھی دیتا ہے، پھر وہ اپنے والد اور اپنے خاندان کی طرف لوٹ جاتی ہے مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت تو آپ کے اصل اور آپ کے وہ عصبہ (نسبی رشتہ دار) ہیں جن پر صدقہ حرام ہے۔[2]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ فرمان کہ آل محمد پر صدقہ حرام ہے اور زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کے اس جواب کہ اہل بیت سے مراد وہ ہیں جن پر صدقہ حرام ہے، سے ایک تو یہ واضح ہوتا ہے کہ ''آل'' اور ''اہل'' کا لفظ ایک ہی معنیٰ میں آتا ہے۔ دوسرا یہ واضح ہوا کہ اہل بیت سے مراد سیدنا علی، عقیل، جعفر اور عباس رضی اللہ عنہم کی آل اولاد ہیں۔

اس بارے میں جملہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے صرف زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کا قول منقول ہے۔ اور جب تک کوئی اور قول سامنے نہ آئے یہ ہمارے لیے قول فیصل کی حیثیت رکھتا ہے اور بہت سے شارحین حدیث کی وضاحت پر بھاری ہے۔ اگرچہ کئی شارحین نے ان دونوں روایات کو اضطراب زدہ قرار دے کر سیدنا زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کا وہم بھی قرار دیا ہے۔

[1] صحیح مسلم، حدیث: 2408۔ [2] صحیح مسلم، حدیث: 2408.

خلاصۂ بحث

- آیتِ تطہیر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج اور اولاد تمام شامل ہیں۔
- اس کے علاوہ مطلق طور پر جب بھی اہل بیت کا لفظ بولا جائے گا تو اس سے مراد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہی اقرباء ہوں گے جن پر صدقہ حرام ہے۔ جیسا کہ سیدنا زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کی حدیث سے واضح ہے اور خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اشارہ فرمایا ہے۔
- اور درود شریف میں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آل کا ذکر ہے اس میں ازواج اور اولاد دونوں شامل ہیں، لہٰذا ادب و احترام میں بھی جملہ اہل بیت کو شامل سمجھا جائے۔ کسی ایک کی تنقیص روا نہیں ہے۔

اہل بیت رضی اللہ عنہم کا ادب و احترام

ہر ایک شخص کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ جس طرح اس کا ادب و احترام اور عزت کی جاتی ہے اسی طرح اس سے منسوب لوگوں کا بھی ادب و احترام کیا جائے۔ یقیناً آپ علیہ السلام کی یہ خواہش فطری بھی تھی اور شرعی بھی۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى﴾

"کہہ دیجیے! میں اس (تبلیغ دین) پر کوئی بدلہ نہیں چاہتا مگر رشتے داری کی محبت۔"[1]

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے بقول اس آیت میں یہ مضمون بیان ہوا ہے کہ قریش کے تمام قبائل سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت داری تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے یہ فرما رہے

(1) الشوریٰ 23:42.

تھے کہ اس قرابت داری کا خیال تو رکھو۔[1]

مجھے ایذائیں تو نہ پہنچاؤ۔ ہر چند اس آیت کا تعلق براہ راست ہمارے زیر بحث عنوان سے نہیں مگر یہ بات ضرور ثابت ہوتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عزیز و اقارب سے صلہ رحمی اور ان کا ادب واحترام ضروری ہے۔ کیونکہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اقارب کو اس بات کی تلقین کر رہے ہیں تو دوسروں کو بالاولی ان کا ادب واحترام اور ان سے صلہ رحمی کرنی چاہیے۔

حدیثِ غدیر

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غدیر خم کے موقع پر اپنے اہل بیت رضی اللہ عنہم کے بارے میں بڑی تاکید فرمائی۔ سیدنا زید بن ارقم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن خم نامی چشمے پر خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کی، وعظ ونصیحت کی، پھر فرمایا:

((أَمَّا بَعْدُ! أَلَا أَيُّهَا النَّاسُ! فَإِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ يُوشِكُ أَنْ يَأْتِيَ رَسُولُ رَبِّي فَأُجِيبَ وَأَنَا تَارِكٌ فِيكُمْ ثَقَلَيْنِ أَوَّلُهُمَا كِتَابُ اللّٰهِ. فِيهِ الْهُدٰى وَالنُّورُ. فَخُذُوا بِكِتَابِ اللّٰهِ وَاسْتَمْسِكُوا بِهِ)).

أما بعد! خبردار آگاہ رہو میں بشر ہوں۔ ممکن ہے کہ عنقریب میرے پاس میرے رب کا قاصد پیغام لے کر آ جائے اور میں لبیک کہہ دوں۔ میں تم میں دو بھاری چیزیں چھوڑ رہا ہوں ان میں سے پہلی چیز تو اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے۔ اس میں

[1] صحيح البخاري، حديث:4818.

ہدایت اور نور ہے پس اللہ تعالیٰ کی کتاب کو لے لو اور اسے مضبوطی سے تھام لو۔"

آپ علیہ السلام نے کتاب اللہ پر بہت آمادہ کیا اور اس کی بھرپور ترغیب دی۔

((وَأَهْلُ بَيْتِي، أُذَكِّرُكُمُ اللّٰهَ فِي أَهْلِ بَيْتِي، أُذَكِّرُكُمُ اللّٰهَ فِي أَهْلِ بَيْتِي، أُذَكِّرُكُمُ اللّٰهَ فِي أَهْلِ بَيْتِي)).

"اور دوسری چیز میرے اہل بیت ہیں۔ میں اپنے اہل بیت کے بارے میں تمھیں اللہ تعالیٰ یاد دلاتا ہوں۔"

یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ فرمایا۔ حدیث میں اس کے بعد زید بن ارقم رضی اللہ عنہ اور حصین بن سبرہ رضی اللہ عنہ کا وہی مکالمہ ہے جو گزر چکا ہے۔[1]

اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ اہل بیت اطہار رضی اللہ عنہم کا مکمل خیال رکھا جائے اور ان کے ادب و احترام میں کوئی کمی نہ آنے دی جائے۔ یہ بہت بڑی اور بھاری نصیحت ہے۔ اللہ کی یاد دلانے کا مطلب یہ ہے کہ نہ ظاہری طور پر ایسا کوئی کام ہو اور نہ مخفی طور پر ایسا کوئی اقدام ہو جس سے اہل بیت رضی اللہ عنہم کے مقام میں کوئی فرق آئے۔ دل بھی بالکل صاف ہو۔ ناصبیت سے بھی پاک ہو اور رافضیت سے بھی مبرا ہو۔

اہل بیت رضی اللہ عنہم اور غلو

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تذکیر میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اہل بیت رضی اللہ عنہم کے ساتھ عقیدت و احترام میں غلو کے حوالے سے بھی اللہ سے ڈرا جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان میں واضح اشارہ ہے کہ اہل بیت کی شان اور مقام میں کمی بیشی ہوگی۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ کمی کرنے والے نہ ہونے کے برابر ہیں، اور ان کے اس جرم سے اہل بیت

[1] صحیح مسلم، حدیث:2408.

کے مقام میں کوئی فرق نہیں آتا جبکہ اہل بیت رضی اللہ عنہم کی شان میں غلو کرنے والوں کی معقول تعداد ہے۔ اور غلو سے دین میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ ادب و احترام اسی حد تک اور اسی انداز سے روا ہے جس قدر شریعت نے اجازت دی ہے۔ بھلا دیکھیں تو اہل بیت رضی اللہ عنہم کا احترام اور عزت و اکرام کی وجہ یہ ہے کہ ان کا تعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خانوادے سے ہے۔ تو انھی کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین عالیہ کی مخالفت اور دین کی تردید کی جائے تو یہ مسلمان کے شایان نہیں۔

جو لوگ اہل بیت کی شان میں غلو کرتے ہیں خود ان کی کتب میں ایسی روایات موجود ہیں جن میں اس کام سے روکا گیا ہے، چنانچہ اہل غلو کی اپنی کتاب میں ہے:

((قَالَ أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ علیہ السلام: اَللّٰهُمَّ! إِنِّي بَرِيءٌ مِنَ الْغُلَاةِ كَبَرَائَةِ عِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ مِنَ النَّصَارٰى. اَللّٰهُمَّ! اخْذُلْهُمْ أَبَدًا. وَلَا تَنْصُرْ مِنْهُمْ أَحَدًا)).

''امیر المومنین علیہ السلام (سیدنا علی رضی اللہ عنہ) نے فرمایا: ''اے اللہ! میں غلو اور مبالغہ کرنے والوں سے اسی طرح اظہار براءت کرتا ہوں جس طرح عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام نے نصاریٰ سے اظہار براءت کیا تھا۔ اے اللہ! انھیں ہمیشہ بے یار و مددگار چھوڑ اور ان میں سے کبھی کسی کی بھی مدد نہ کر۔''[1]

اسی طرح یہ بھی مروی ہے:

((اَلصَّادِقُ علیہ السلام: 'اَلْغُلَاةُ شَرُّ خَلْقِ اللّٰهِ يُصَغِّرُونَ عَظَمَةَ اللّٰهِ وَيَدَّعُونَ الرُّبُوبِيَّةَ لِعِبَادِ اللّٰهِ. وَاللّٰهِ! إِنَّ الْغُلَاةَ شَرٌّ مِنَ

[1] مناقب آل أبي طالب لزين الدين محمد بن علي بن شهر آشوب: 1/324 .

الْيَهُودِ وَالنَّصَارٰى وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا)).

”غالی لوگ اللہ کی بدترین مخلوق ہیں جو اللہ کی عظمت کو گھٹاتے ہیں اور صفتِ ربوبیت کو بندوں کے لیے ثابت کرنے کے دعویدار ہیں۔ اللہ کی قسم! غالی (غلو کرنے والے) یہود، نصاریٰ اور مشرکین سے بھی بدتر ہیں۔“[1]

سیدنا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما اور اہل بیت رضی اللہ عنہم کا ادب و احترام

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت سے اہل بیت رضی اللہ عنہم کے مقام و مرتبے اور حقوق کا خوب درس ملا تھا، اسی وجہ سے آپ رضی اللہ عنہ فرماتے تھے:

((أُرْقُبُوا مُحَمَّدًا فِي أَهْلِ بَيْتِهِ)).

”رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی لاج رکھتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کا خیال رکھو۔“[2]

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا یہ حکم نامہ خلیفۂ وقت ہونے کی حیثیت سے تھا۔ اسی طرح سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر یہ بھی فرمایا تھا:

((وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ! لَقَرَابَةُ رَسُولِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم أَحَبُّ إِلَيَّ أَنْ أَصِلَ مِنْ قَرَابَتِي)).

”اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اپنے اقرباء سے صلہ رحمی کرنے سے مجھے یہ زیادہ پسند ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عزیز و اقارب سے صلہ رحمی اور حسن سلوک کروں۔“[3]

---

[1] مناقب آل أبي طالب لزين الدين محمد بن علي بن شهر آشوب: 324/1۔ [2] صحيح البخاري، حديث: 3713۔ [3] صحيح البخاري، حديث: 3712.

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی اہل بیت رضی اللہ عنہم کا بہت خیال رکھتے تھے۔ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں ایک دفعہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور دیکھا کہ آپ رضی اللہ عنہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ محو گفتگو ہیں اور ابن عمر رضی اللہ عنہما دروازے پر کھڑے منتظر تھے، اسی اثنا میں ابن عمر رضی اللہ عنہما بھی واپس آ گئے اور میں بھی آ گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بعد میں مجھ سے ملے تو کہنے لگے: تم نظر ہی نہیں آتے؟ میں نے کہا: امیر المومنین! میں آیا تھا مگر آپ معاویہ رضی اللہ عنہ سے محو گفتگو تھے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما واپس چلے گئے تو میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ ہی واپس چلا گیا تھا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

((أَنْتَ أَحَقُّ بِالْإِذْنِ مِنِ ابْنِ عُمَرَ، فَإِنَّمَا أَنْبَتَ مَا تَرَىٰ فِي رُؤُوسِنَا اللّٰهُ ثُمَّ أَنْتُمْ)).

”تم ابن عمر سے زیادہ اجازت کا حق رکھتے ہو۔ یقیناً تم ہمارے سر پر جو عزت و شرف کا تاج دیکھ رہے ہو یہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور اس کے بعد تمھاری وجہ سے ہے۔“[1]

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا یہ اظہار بھی خلیفہ وقت ہونے کی حالت میں ہے جیسا کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ انھیں ”امیر المومنین“ کے خطاب سے یاد کر رہے ہیں۔ علاوہ ازیں اپنے لخت جگر اور ابن عمر رضی اللہ عنہما جیسے سپوت سے زیادہ اہمیت دے رہے ہیں۔

لہٰذا قرآن و سنت اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی تعلیمات اور طرز عمل کی روشنی میں اہل بیت رضی اللہ عنہم کے متعلق افراط و تفریط سے بچ کر ان کا ادب و احترام ہر مسلمان پر واجب ہے۔

[1] الإصابة:69/2، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔

اہل بیت رضی اللہ عنہم کے ادب و احترام کی صورتیں

ـــ اہل بیت رضی اللہ عنہم سے محبت کا تعلق رکھیں اس طرح اللہ کی محبت نصیب ہو گی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ سے دعا کی تھی: ''اے اللہ حسنین کریمین رضی اللہ عنہما سے محبت فرما اور جو ان سے محبت کرتا ہے، ان سے بھی محبت فرما۔''[1] یہ دعا صرف اسی دور کے لوگوں کے حق میں نہیں تھی بلکہ قیامت تک کے لیے ہے۔ جو اللہ کی محبت چاہتا ہے وہ اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ یہ کلیہ بھی اپنائے۔ وہ اللہ کی محبت محسوس کرے گا۔ اور ان کی محبت کو اپنے ایمان کا حصہ بنائیں۔ اور جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتے ہیں اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت سے بھی محبت کریں۔

ـــ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

((فَانْظُرُوا كَيْفَ تَخْلُفُونِي فِيهِمَا)).

''دیکھو! تم کتاب اللہ اور میرے اہل بیت کے ساتھ میرے بعد کیسا سلوک کرتے ہو۔''[2]

اسلوب کلام امت کے کندھوں پر بہت بڑی ذمہ داری ڈال رہا ہے۔ گویا امت ایک امتحان سے گزر رہی ہے۔ لہٰذا ان کی شان میں ایسے کلمات نہیں کہنے چاہئیں جو ان کے شایان شان نہ ہوں۔ اور نہ ہی ایسا کوئی ذہن رکھنا چاہیے۔ تاکہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملیں تو یہ عرض کرسکیں کہ اللہ کے نبی! آپ نے فرمایا تھا دیکھو! میرے اہل بیت سے میرے بعد کیسا سلوک کرتے ہو یہ حدیث ہم تک امام ترمذی کی وساطت سے پہنچی تھی اور ہم نے اہل بیت سے بہت اچھا تعلق قائم رکھنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔

[1] جامع الترمذي، حديث:3858۔ [2] جامع الترمذي، حديث:3788.

ـــ صحابہ کرام اور اہل بیت رضی اللہ عنہم کے مابین ہونے والی کوئی بات ہمارے سامنے آئے تو ہم ان کے جج نہ بنیں کیونکہ کسی ایک کو ہم حق پر ثابت کریں گے۔ ہم اپنی حیثیت دیکھیں اور یہ بھی دیکھیں کہ ہم کن عظیم ہستیوں کے متعلق فیصلہ دے رہے ہیں۔ ان کا منصب اس سے بہت اونچا ہے کہ بعد کا کوئی شخص صحابہ کرام اور اہل بیت رضی اللہ عنہم کا جج بن بیٹھے۔ کسی کو وہ حق پر ثابت کرے اور کسی کو باطل پر۔

ـــ تاریخ کے جن بدنصیبوں نے اہل بیت رضی اللہ عنہم کی شان میں ہرزہ سرائی کی یا اپنے ہاتھوں کو ان کے پاک لہو سے رنگا، ان سے اظہار براءت کریں اور جو بدنصیب لوگ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی مظلومانہ شہادت میں کسی بھی لحاظ سے شریک تھے ان سے مکمل اظہار براءت کیا جائے۔

ایک اہم واقعہ

اس سلسلے میں عثمان بن ہیثم رحمہ اللہ کا یہ واقعہ یاد رکھیں۔ وہ کہتے ہیں کہ بصرہ کا ایک رہائشی عبید اللہ بن زیاد کا کمانڈر تھا۔ چھت سے گر کر اس کی ٹانگیں ٹوٹ گئیں۔ ابو قلابہ رحمہ اللہ اس کی عیادت کے لیے گئے تو فرمانے لگے: اس میں بھی تمھارے لیے کوئی بہتری ہوگی۔ وہ کہنے لگا: میری دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئی ہیں بھلا اس میں کیا بہتری ہے! اس مکالمے کو تین دن ہی گزرے تھے کہ عبید اللہ بن زیاد کا ہرکارہ آیا اور کہنے لگا: حسین (رضی اللہ عنہ) سے قتال کے لیے نکلو۔ وہ بولا: اس حالت میں میں کیسے جا سکتا ہوں؟ بہرحال 7 دن بعد اسے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کی المناک خبر موصول ہوئی تو وہ کمانڈر پکار اٹھا:

((رَحِمَ اللّٰهُ أَبَا قِلَابَةَ)).

''اللہ تعالیٰ ابو قلابہ پر رحم فرمائے انھوں نے سچ کہا تھا۔'' [1]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عہد کا ایک شخص یہ اظہار کر رہا ہے کہ میری ٹانگیں ٹوٹ جانا بہتر تھا اس سے کہ میں سیدنا حسین بن علی رضی اللہ عنہما کی شہادت میں کسی بھی طرح شریک ہوتا۔

ــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے والے کے لیے وعید بیان کی تھی۔

سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((يَا أَبَا تُرَابٍ! أَلَا أُحَدِّثُكُمَا بِأَشْقَى النَّاسِ رَجُلَيْنِ؟))

''اے ابوتراب! تمام لوگوں سے زیادہ بدبخت ترین دو لوگوں کے بارے میں تمھیں نہ بتاؤں؟''

ہم نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! کیوں نہیں! فرمایا: ''ثمود میں سے اُحیمر جس نے (صالح علیہ السلام کی) اونٹنی کی کونچیں کاٹی تھیں۔ اور دوسرا وہ جو تجھے اس پر (یعنی سر کے اوپر) مارے گا جس سے تیری ڈاڑھی لہو سے تر ہو جائے گی۔'' [2]

ملاحظہ کیجیے کہ دوسرے کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شہادت کی پیش گوئی بھی فرمائی گئی مگر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے قاتل کو شقی ترین قرار دیا گیا۔ اس سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی عظمت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اسی طرح سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف اقدام کرنے والوں کو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منافق قرار دیا تھا۔ حدیث کے الفاظ ہیں:

((يَا عُثْمَانُ! عَسَى أَنْ يُّقَمِّصَكَ اللّٰهُ قَمِيصًا. فَإِنْ أَرَادَكَ الْمُنَافِقُونَ عَلَى خَلْعِهِ فَلَا تَخْلَعْهُ)).

[1] تاریخ دمشق الکبیر: 232/30۔ [2] السلسلة الصحيحة، حديث: 1743.

''عثمان (رضی اللہ عنہ)! ممکن ہے اللہ تمھیں ایک قمیص (خلافت) پہنائے تو اگر منافقین اسے اتارنے کا مطالبہ کریں تو تم اسے نہ اتارنا۔''[1]

یہ آپ نے تین بار ارشاد فرمایا۔

لہٰذا امت کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اہل بیت رضی اللہ عنہم کے فیصلے چکانے کی بجائے زیادہ فوکس ان کے دشمنوں پر کرنا چاہیے۔

▪ بعض دفعہ عظیم ہستیوں کی طرف مختلف باطل نظریات منسوب کر دیے جاتے ہیں بلکہ مذہب بھی بن جاتے ہیں جیسے عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب مذہب عیسائیت ہے۔ ایسی صورت میں ان عظیم ہستیوں کے ادب و احترام میں بھی فرق آ جاتا ہے، حالانکہ ان ہستیوں کا ان باطل نظریات میں کوئی دخل نہیں ہوتا، لہٰذا اہل بیت رضی اللہ عنہم کی طرف منسوب غلط عقائد و نظریات کے باوجود ہمیں ان کا مکمل ادب و احترام کرنا چاہیے کیونکہ وہ کتاب و سنت کے مخالف نظریات سے بری ہیں۔ عموماً ایسی عظیم ہستیاں متنازع بن جاتی ہیں مگر ایک مسلمان کی سوچ اس سے بلند ہونی چاہیے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کو متنازع شخصیات سمجھ بیٹھے۔

▪ اہل بیت رضی اللہ عنہم کا یہ بھی ایک ادب ہے کہ ان کے نام پر امت کو منتشر نہ کیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا تھا:

((إِنَّ ابْنِي هٰذَا سَيِّدٌ وَلَعَلَّ اللّٰهَ أَنْ يُّصْلِحَ بِهٖ بَيْنَ فِئَتَيْنِ عَظِيمَتَيْنِ مِنَ الْمُسْلِمِينَ)).

''یقیناً میرا یہ بیٹا سردار ہے۔ اللہ تعالیٰ سے اُمید ہے کہ وہ اس کے سبب مسلمانوں

[1] المعجم الأوسط، حديث:2833.

کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرائے گا۔“[1]

یہ حدیث سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کے حوالے سے اس وقت بیان کی جب انھوں نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی صلح کی پیشکش قبول فرما کر صلح کر لی۔ جب سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ جذبات تھے تو وہ امتی جو سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی وجہ سے امت میں افتراق و انتشار ڈال رہے ہیں، وہ کیونکر نگاہِ رسالت میں کوئی مقام بنا سکتے ہیں۔

▪ اہل بیت رضی اللہ عنہم کے ادب و احترام کے لیے ضروری نہیں کہ دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ثابت شدہ فضائل و مناقب سے انکار کیا جائے کیونکہ ہر ایک کا اپنا اپنا مقام ہوتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فضائل بھی زبان نبوت ہی سے جاری ہوئے ہیں۔

▪ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا تھا:

((... فَمَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ. اَللّٰهُمَّ وَالِ مَنْ وَّالَاهُ وَعَادِ مَنْ عَادَاهُ)).

”چنانچہ جس کا میں دوست ہوں علی بھی اس کا دوست ہے۔ اے اللہ! جو اسے دوست سمجھے تو اسے دوست سمجھ اور جو اس سے دشمنی کرے تو بھی اس سے دشمنی کر۔“[2]

یہ روایت اہل ایمان سے یہ تقاضا کرتی رہے گی کہ ان کا تعلق سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور ان کے خانوادے سے بہت اچھا ہونا چاہیے۔

اسی مذکورہ روایت میں یہ بھی ہے کہ آپ نے غدیر خم کے موقع پر فرمایا:

[1] صحيح البخاري، حديث:2704۔ [2] مسند أحمد:1/119.

((أَلَسْتُ أَوْلَى بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ وَأَزْوَاجِي أُمَّهَاتُهُمْ؟))

''کیا میں مومنوں کے ہاں سب سے زیادہ قریبی نہیں ہوں اور میری ازواج ان کی مائیں نہیں ہیں؟''[1]

لٰہذا سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور ان کی آل اولاد سے محبت اور دوستی کے ساتھ ساتھ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے دلی محبت اور ان کا احترام بھی ضروری ہے کہ وہ امت کی مائیں ہیں۔ جب اپنی ماں سے ادب و احترام کا معاملہ کرنے کا حکم ہے تو پوری امت کی ماؤں سے ادب و احترام کا کیسا تقاضا ہوگا!!

جملہ اہل بیت رضی اللہ عنہم جن میں آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی شامل ہیں اور ازواج رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی دونوں سے عزت و احترام کا معاملہ ہوگا۔ تب جا کر اہل بیت اطہار رضی اللہ عنہم کے ادب و احترام کا باب مکمل ہوگا۔

اہل بیت رضی اللہ عنہم کے لیے ''علیہ السلام'' کہنا یا لکھنا

یہ ایک اہم سوال ہے جس کا جواب یہ ہے کہ کسی دور میں کچھ اصطلاحیں یا الفاظ کسی کے لیے خاص ہوجاتے ہیں۔ جس دور میں جو اصطلاحیں یا الفاظ جس زبان میں جن کے ساتھ خاص ہوں انھیں انھی کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔ جیسے رحمہ اللہ یا رحمۃ اللہ علیہ کا لفظ ہے، یہ فوت شدگان کے لیے خاص ہے۔ اگرچہ شریعت میں ایسی کوئی پابندی نہیں کہ زندوں کے لیے آپ رحمہ اللہ نہیں کہہ سکتے۔ مگر رحمہ اللہ یا رحمۃ اللہ علیہ کہنے یا لکھنے سے اردو دان طبقہ یہ سمجھ جاتا ہے کہ جن کے لیے یہ لکھا بولا جا رہا ہے وہ فوت ہو چکے ہیں۔ اسی طرح ہمارے اس دور میں ''علیہ السلام'' کے الفاظ انبیاء کرام علیہم السلام کے لیے، رضی اللہ عنہم کا لفظ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے

[1] مسند أحمد:1/119.

اور رحمہ اللہ کا لفظ ائمہ دین اور فوت شدگان کے لیے لکھا، بولا، سمجھا پڑھا جاتا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ شریعت کی طرف سے ایسی کوئی پابندی نہیں ہے۔ مگر عرف اور دستور کو بھی اہمیت حاصل ہے، لہٰذا اہل بیت رضی اللہ عنہم کے ساتھ علیہ السلام لکھنے سے یہ شائبہ ہوتا ہے کہ ان کا شمار انبیائے کرام علیہم السلام میں کیا جارہا ہے۔ اگر کوئی لغوی اعتبار سے اس کا جواز نکالے گا تو اسے یہ بھی ثابت کرنا پڑے گا کہ آج کے کسی شخص کے نام کے ساتھ علیہ السلام فلاں دلیل کے تحت نہیں لکھ سکتے۔ یا پھر ہر ایک کے لیے کھلی اجازت ہونی چاہیے۔ جیسے غائبانہ سلام کا جواب دینے کے لیے "علیک وعلیہ السلام" کے الفاظ ثابت ہیں۔ مگر کوئی بھی اس بات کی جازت نہیں دے گا کہ عام لوگوں کے ناموں کے ساتھ "علیہ السلام" کا لفظ لکھا جائے۔

کتب احادیث میں بھی اہل بیت رضی اللہ عنہم کے ساتھ "علیہ السلام" کے لفظ آئے ہیں، جیسا کہ صحیح بخاری، حدیث: 2911 میں سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ (علیہ السلام) لکھا ہوا ہے۔ اسی طرح قدیم کتب کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ وہاں ائمہ دین کے لیے "رضی اللہ عنہ" کے الفاظ لکھے ہوتے ہیں مگر چونکہ اس دور میں یہ اصطلاحیں کسی کے لیے خاص نہیں تھیں اس لیے ایسا ہوتا رہا لیکن فی زمانہ یہ اصطلاحیں اور الفاظ خاص ہیں، لہٰذا انھیں انھی معانی میں سمجھا، لکھا، پڑھا اور بولا جائے۔ واللہ اعلم

اللہ تعالیٰ ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی لاج رکھتے ہوئے آپ علیہ السلام کے جملہ اہل بیت رضی اللہ عنہم کا دلی ادب کرنے کی اور مقام پہچاننے کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین

باب : 8

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا ادب واحترام

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم وہ عظیم ہستیاں ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کے لیے منتخب فرمایا، دین کی سربلندی کے لیے چنا، دعوتِ اسلام کی سعادت بخشی اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں سے جہاد کے اعزاز سے نوازا۔ انھوں نے لازوال قربانیاں پیش کر کے وہ تاریخ رقم کی جس کی مثال نہیں ملتی۔

اصطلاحی طور پر صحابی اس سعادت مند شخصیت کو کہتے ہیں جس نے حالتِ ایمان میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عہد پایا۔

مطلق طور پر تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور انفرادی طور پر متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بہت سے فضائل ومناقب قرآنی آیات اور کتب احادیث میں موجود ہیں اور رہتی دنیا تک موجود رہیں گے۔

اس حقیقت کی طرف توجہ ضروری ہے کہ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس میں تمام اہل بیت رضی اللہ عنہم اور ان کے علاوہ دیگر صحابہ کرام شامل ہوتے ہیں۔ منافق پر صحابی کا اطلاق نہیں ہوتا۔ یہی اسلوب قرآن مجید میں اختیار کیا گیا ہے کہ منافقوں کی خامیاں علیحدہ طور پر بیان کی گئی ہیں اور عہدِ نزولِ قرآن کے مومنوں کا تذکرہ، ان کی صفات اور خوبیاں علیحدہ طور پر بیان کی گئی ہیں۔ ان دونوں قسم کے افراد میں بُعد المشرقین ہے۔ کچھ تو وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہمیشہ اسلام کی مخالفت کی،

دعوت کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کیں، ہر اہم موقع پر ساتھ چھوڑا، اللہ کے رسول ﷺ کو اذیتیں دیں اور اہل ایمان کے بارے میں ہمیشہ منفی کردار ادا کیا۔ یہ منافقین ہیں۔ جبکہ اس مقابلے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے جو اسلام کے مددگار بنے، اسلام کی سربلندی کے لیے زندگیاں صرف کیں، دعوت اسلام کو مشرق و مغرب میں پھیلایا، رسول اللہ ﷺ کا ہمیشہ ساتھ دیا، آپ ﷺ کی رفاقت اور صحبت سے فیض یاب ہوئے، اہل ایمان کا دفاع کرتے رہے، اپنا سب کچھ راہ جہاد میں قربان کر دیا۔

ان دونوں قسم کے لوگوں میں واضح فرق موجود ہے۔ ان کو آپس میں ملا دینا قرآن مجید میں تحریف معنوی کے مترادف ہے۔

یہ بھی ایک سوال ہے کہ ہجرت کرنے والے قریشی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مکہ مکرمہ میں تو تکالیف برداشت کرتے رہے اور تیرہ سالہ آزمائش کا دور گزارہ، ظلم برداشت کیے، ہجرت حبشہ کی، پھر نامساعد حالات میں ہجرت مدینہ کی اور اپنا گھر بار، کاروبار اور جائیداد قربان کی...... تو نعوذ باللہ مدینہ منورہ آ کر کونسی ایسی ضرورت تھی کہ انھیں اسلام کو خیر باد کہنا پڑا۔

اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر طعن و تشنیع کرنے والے نعوذ باللہ انھیں منافق بھی قرار دیتے ہیں اور مرتد بھی، حالانکہ منافق کو مرتد قرار دیے جانے کی ضرورت نہیں وہ تو دائرۂ اسلام میں داخل ہی نہیں ہوا ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ان الزامات سے بالکل بری تھے۔

بھلا سوچیں! عہدِ نبوت کے بعد مرتدین کے خلاف جنگیں لڑی گئیں اور کامیابیاں نصیب ہوئیں۔ کیا کوئی عقلمند شخص یہ تسلیم کر سکتا ہے کہ نعوذ باللہ جنگ لڑنے والے بھی اور جن کے خلاف جنگیں بپا کی گئیں دونوں ہی مرتد تھے۔

یا للعجب!

قرآن وسنت کے بہت سے دلائل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ادب واحترام کرنے اوران کا مقام پہچاننے اوران کی گستاخی سے بچنے کی بابت وارد ہوئے ہیں۔ اب ہم ایک اہم سوال کی طرف آتے ہیں، وہ یہ ہے کہ

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ادب واحترام کرنا کیوں ضروری ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے:

1 دین اسلام کی بنیاد قرآن وحدیث ہیں۔ اگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو درمیان سے نکال دیا جائے یا ان کے ایمان کے بارے میں شک کیا جائے تو قرآن وحدیث کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ یہی مقدس ہستیاں ہیں جنھوں نے قرآن مجید کی تدوین کی، احادیث مبارکہ بیان کیں اور اسلام کے گواہ بنے۔ اس وجہ سے جو لوگ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں مختلف قسم کے شکوک وشبہات میں گرفتار ہیں ان کے ہاں قرآن وحدیث بھی مشکوک ہیں۔

امام ابوزرعہ رحمہ اللہ کا قول

امام ابوزرعہ رازی رحمہ اللہ کا یہ قول کس قدر معنی خیز ہے: ''جب تو کسی شخص کو دیکھے کہ وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تنقیص کر رہا ہے تو تو سمجھ لے کہ وہ زندیق ہے۔ اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم برحق ہیں اور قرآن مجید بھی برحق ہے اور جو کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں وہ بھی حق سچ ہے۔ اور ہم تک یہ سب کچھ پہنچانے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں۔ زندیق لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے گواہوں کو ناقابلِ اعتبار بنا دیں تاکہ کتاب وسنت کالعدم قرار پائیں۔''[1]

2 صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اللہ تعالیٰ نے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت وصحبت کے لیے منتخب

[1] الحديث والمحدثون نقلا عن الإصابة (مقدمة التحقيق) ص:22.

فرمایا۔ اگر ہم کسی نیک شخص کی صحبت اختیار کرنے کو اعزاز سمجھتے ہیں تو وہ لوگ کس قدر قابل تعظیم ہیں، جنھیں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کے لیے منتخب فرمایا۔

3 صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔

4 اللہ تعالیٰ نے کفار کے متعلق فرمایا کہ ''اگر وہ، یعنی کفار تم، یعنی صحابہ جیسا ایمان لائیں تو وہ ہدایت پر ہیں۔ اور اگر وہ اس سے روگردانی کریں تو وہ عین گمراہی میں ہیں۔''[1]

غرضیکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مثالی مسلمان ہیں۔ اگر مثالی طالب علم مقام رکھتا ہے تو مثالی مسلمان اور وہ بھی اللہ کی نگاہ میں، وہ مقام کیوں نہ رکھیں۔

5 اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث مبارکہ میں متعدد بار ان کی بخشش کا اعلان اور ان سے رضا مندی کا اظہار فرمایا اور جنت کی بشارتیں دی ہیں۔ جن خوش نصیبوں کو اس قسم کے اعزازات سے نوازا گیا ہو وہ اس لائق ہیں کہ ان کا ادب و احترام کیا جائے۔ اللہ کرے ہم جنت میں پہنچ جائیں۔ آخر جنت میں کس منہ سے ان کے سامنے ہوں گے۔

6 اولیائے کرام میں سب سے پہلے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آتے ہیں۔ کیونکہ حقیقت میں ولی کہلانے کا حق دار وہی ہے جو مکمل طور پر اسلام سے وابستہ ہے اور اس کی تعلیمات کے راستے سے اللہ کا قرب چاہتا ہے، لہٰذا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس سلسلے میں عدیم النظیر کردار پیش کیا۔ جب اولیاء کا احترام مسلمہ ہے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا کیوں نہیں؟

7 اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی متعدد صفات قرآن مجید میں بیان فرمائی ہیں، جیسا کہ فرمایا:

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ

[1] البقرۃ 2:137.

بَیۡنَهُمۡ ...﴾

’’محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں اور جو ان کے ساتھ ہیں وہ کفار کے لیے سخت اور آپس میں نہایت مہربان ہیں......‘‘ [1]

اس سے واضح ہوتا ہے کہ نبوت کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ان صفات کے حامل لوگوں کی ضرورت تھی۔

8 صحابہ کرام رضی اللہ عنہم وہ ہستیاں ہیں جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کی نصرت فرمائی، چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿هُوَ الَّذِيٓ اَيَّدَكَ بِنَصۡرِهٖ وَبِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ﴾

’’وہ ذات جس نے اپنی نصرت اور مومنین کے ذریعے سے آپ کی تائید کی۔‘‘ [2]

جن شخصیات کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید فرمائی ان کا احترام کیوں نہ ہو!!

9 صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم وہ ہستیاں ہیں جنھوں نے اس وقت دین کی نصرت وحمایت کی جب یہ بالکل نیا، اجنبی اور کمزور سمجھا جاتا تھا۔ اس وقت ساتھ دیا جب اسلام کو انھی جیسے افراد کی اشد ضرورت تھی۔ وہ افراد جو اخلاص کی دولت سے مالا مال، جذبہ قربانی سے سرشار، ایمان ویقین میں راسخ، علم وعمل میں پختہ اور صبر وثبات کے پیکر ہوں۔ اور یہ خوبیاں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بدرجہ اتم پائی جاتی تھیں۔ گویا انھوں نے اپنی تمام تر توانائیاں صرف کر کے اسلام کے گلشن کی آبیاری کی۔ اور ایک ایسے وقت میں دعوت اسلام کی حمایت کی جب اسلام کو ایسے ہی افراد درکار تھے۔

[1] الفتح 29:48۔ [2] الأنفال 62:8.

10 صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے دین کی سربلندی اور اشاعت و تبلیغ کے لیے جو کارہائے نمایاں انجام دیے اسی کا ثمر ہے کہ آج روئے زمین پر 57 اسلامی ممالک اور مجموعی طور پر ڈیڑھ ارب کے قریب مسلمان بستے ہیں اور الحمد للہ یہ تعداد روز افزوں ہے۔ اس ثواب میں سب سے پہلے ہمارے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم آتے ہیں۔ اس کے بعد کسی نہ کسی صحابی کا بنیادی کردار ہے کہ یہ دین ہم تک پہنچا اور وہ ثواب میں برابر کے شریک ہیں۔ ان کے اس مقام کا اظہار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ بدر کے موقع پر فرمایا تھا کہ:

((اَللّٰهُمَّ ! إِنَّكَ إِنْ تُهْلِكْ هٰذِهِ الْعِصَابَةَ مِنْ أَهْلِ الْإِسْلَامِ لَا تُعْبَدُ فِي الْأَرْضِ)).

"اے اللہ! اگر آج یہ مٹھی بھر اہل اسلام تو نے نہ رہنے دیے تو پھر پوری زمین پر تیری عبادت نہ ہوگی۔"[1]

11 اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو اسوۂ حسنہ قرار دیا ہے۔ کیا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو درمیان سے نکال کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی ہمارے لیے اسوہ قرار پا سکتی ہے؟ اور اسلام کی واقعتا وہ صورت باقی رہ سکتی ہے کہ وہ عالمگیریت، اجتماعیت کے ساتھ ساتھ زندگی کے ہر پہلو کو دامن میں لیے ہوئے ہو۔ الغرض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا کردار سامنے آئے گا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ کی پہچان ہو سکے گی کہ آپ نے فلاں موقع پر کیا حکم صادر فرمایا؟ معاملات کیسے نبھائے؟ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جاری کردہ احکام کی عملی تصویر کیسے سامنے آئی؟

12 صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنی صلاحیتیں بروئے کار لا کر جو تاریخ رقم کی اس کی مثال

[1] صحیح مسلم، حدیث:1763.

تاریخ عالم پیش کرنے سے قاصر ہے۔ آج بھی ایک مسلمان ان کی زندگی کا مطالعہ کر کے اپنے ایمان کو جلاء بخشتا اور کردار میں بہتری لاتا ہے۔ اگر مسلم امہ کے سامنے ایسے اجلے کردار کے حامل لوگ نہ ہوتے تو نہ جانے دین دشمن عناصر مسلمانوں کی فکر و نظر میں کیا کیا رنگ بھرتے۔

13 صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی وہ معزز لوگ تھے جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کو قائم دائم رکھا، اسے ہر لحاظ سے تحفظ فراہم کیا بلکہ دعوت و جہاد اور خلافت و سیاست کے ذریعے اسے تقویت دی۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کو آگے بڑھایا۔

14 صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر طعن درحقیقت اللہ تعالیٰ کے اختیار و انتخاب پر نکتہ چینی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کے لیے انھیں چنا تھا۔ جبکہ منافقین تو ایمان ہی سے خالی تھے۔ ان کا کردار بھی مشکوک تھا اور ان کے سرغنے بھی اور تھے۔

15 صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی خوبیاں ساتوں آسمانوں سے بھی اوپر سے نازل ہوئی ہیں، اس وجہ سے ہمیں بھی ان خوبیوں کو تسلیم کر کے ان کا ادب و احترام کرنا چاہیے۔

16 صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا دور مثالی دور کہلاتا ہے۔ اگر آج ہم اسلامی تعلیمات کے اثرات اور اسلامی نظام کے نفاذ کا مشاہدہ کرنا چاہیں یا کسی غیر مسلم کو یہ باور کرانا چاہیں کہ اسلام صرف کتابوں میں نہیں اسے اپنانے والے بھی تھے۔ تو ہمیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عہد ہی نظر آتا ہے۔ وہ عہد زریں نہ ہوتا تو ہمارے پاس ایسی کوئی مثال نہ ہوتی جسے ہم دوسروں کے سامنے پیش کر سکتے۔

17 صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا مندی کے سرٹیفکیٹ تھے۔ یہ بہت بڑا اعزاز ہے۔ ہمارے پاس تو اپنے جنتی ہونے اور دوسروں کے جہنمی ہونے کے بے بنیاد دعوے ہیں اور بس!!

18 قرآن مجید میں مومنوں کی جس قدر صفات بیان ہوئی ہیں ان پر سب سے پہلے اور مکمل طور پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی پورے اترتے ہیں۔

مندرجہ بالا اور اس قسم کے دیگر اسباب و وجوہ کو دیکھیں تو ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم امت کے محسنین ہیں، لہٰذا امت کا فرض ہے کہ وہ ہر لحاظ سے ان کا ادب واحترام اور دفاع کرے۔ ان کا دفاع حقیقت میں دینِ اسلام کا دفاع ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے فرامین ہیں جن میں واضح حکم دیا گیا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ہر لحاظ سے خیال رکھا جائے۔ فرمانِ نبوی ہے:

((... وَأَصْحَابِي أَمَنَةٌ لِأُمَّتِي فَإِذَا ذَهَبَ أَصْحَابِي أَتَى أُمَّتِي مَا يُوعَدُونَ)).

''اور میرے صحابہ میری امت کے لیے امن کا نشان ہیں تو جب صحابہ چلے جائیں گے تو امت ان حالات سے دوچار ہوگی جن کا اس سے وعدہ کیا گیا ہے۔''[1]

اسی طرح فرمایا:

((لَا تَسُبُّوا أَصْحَابِي)).

''میرے صحابہ کے بارے میں نازیبا الفاظ نہ کہو اور نامناسب انداز نہ اپناؤ۔''[2]

یہ بھی فرمانِ نبوی ہے:

((اِحفَظُونِي فِي أَصْحَابِي)).

''میرے صحابہ کے بارے میں میرا خیال رکھنا۔''[3]

1 صحيح مسلم، حديث:2531۔ 2 صحيح البخاري، حديث:3673۔ 3 سنن ابن ماجه، حديث:2363.

لہٰذا صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں ہر لمحہ بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔

ادب واحترام کی صورتیں

۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عدالت پر مکمل یقین رکھا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دینی امور میں انھیں مکمل قابل اعتماد سمجھا جائے۔ ان کے ایمان، اخلاص اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت و اطاعت میں کسی قسم کا شک نہ کیا جائے۔ اس قدر عظیم ہستیوں کے بارے میں شک کرنے والا خود مشکوک نظر آتا ہے۔

۔ بلا امتیاز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ادب و احترام کیا جائے، خواہ ان کا تعلق اہل بیت سے ہو، قریش سے ہو یا وہ مہاجرین و انصار ہوں یا دوسرے علاقوں سے تعلق رکھتے ہوں۔ فضیلت میں تفاوت ایک علیحدہ چیز ہے مگر ادب و احترام میں تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

۔ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے محبت کا تعلق رکھا جائے کیونکہ آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جن سے وہ محبت کرتا ہوگا۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ قیامت کب قائم ہوگی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَا أَعْدَدْتَ لَهَا؟)).

”تو نے اس کے لیے تیاری کیا کی ہے؟“

اس آدمی نے جواب دیا کہ میں نے اس کے لیے کچھ خاص تیاری نہیں کی۔ (فرائض کے سوا) نہ زیادہ نفلی نمازیں، نہ نفلی روزے اور نہ کوئی نفلی صدقہ کیا ہے لیکن میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((أَنْتَ مَعَ مَنْ أَحْبَبْتَ)).

''تو انھی کے ساتھ ہوگا جن سے تو محبت رکھتا ہے۔''

سیدنا انس رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے محبت کرتا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ میں انھی کے ساتھ ہوں گا کیونکہ میں ان سے محبت کرتا ہوں۔ [1]

- صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اسمائے گرامی آئیں تو ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کی جائے کہ اللہ ان سے راضی ہو جائے اور انھیں راضی کر دے۔ یعنی **رضی اللہ عنهم**

- اپنی مجالس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تذکرہ کیا جائے۔ ان کی سیرت و کردار سے آشنا ہوا جائے اور اس سلسلے کو نسل در نسل چلایا جائے۔ اس سے ہمارے اپنے ایمان کو حرارت نصیب ہوگی۔

- صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی باہمی شکر رنجیوں کے متعلق توقف کیا جائے۔ کیونکہ پہلی بات یہ ہے کہ ان کے بعد کسی کی یہ حیثیت نہیں ہے کہ ان کے بارے میں کوئی فیصلہ دے۔ دوسری بات یہ ہے کہ بالفرض ہم یہ جسارت کرتے ہیں تو اس سے انھیں کیا فرق پڑتا ہے۔ ان کا مقام اس سے بہت بلند ہے کہ ہم جیسے لوگ اٹھ کر ان جلیل القدر شخصیات کے فیصلے چکائیں۔

- اگر خلافت ابھی ملنی ہوتی تو ہماری بحثیں، جھگڑے اور مناظرے کسی کام آتے، جبکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدے اور ترتیب کے مطابق خلافت دے بھی دی، وہ حکومت کر کے جوار رحمت میں جا پہنچے اور انھیں گزرے ہوئے صدیاں بیت گئیں۔ اب ہمارے موقف جو بھی ہوں ان سے تاریخ یا ترتیب تو نہیں بدل سکتی...... اس جرم میں نہ جانے کتنے لوگ اپنے اعمال نامے سیاہ کر رہے ہیں۔

- مشاجرات صحابہ کے متعلق روایات کی کہیں اشد ضرورت ہو تو وہ روایات مکمل تحقیق

[1] صحيح البخاري، حديث:3688 و6171.

کے بعد پیش کریں۔ اور زیادہ تر ان روایات کو بیان کریں جن میں ان کی باہمی محبت کے آثار جھلکتے ہیں۔

ـ ان کے بارے میں نازیبا الفاظ کے بارے میں سوچیں بھی نہ کیونکہ ایک تو عمومی طور پر ہمیں یہ حکم ہے:

((لَا تَسُبُّوا الْأَمْوَاتَ فَإِنَّهُمْ قَدْ أَفْضَوْا إِلٰى مَا قَدَّمُوا)).

''مسلمان فوت شدگان کو برا بھلا نہ کہو کیونکہ جو انھوں نے اپنے لیے آگے بھیج رکھا ہے وہ اس تک پہنچ چکے ہیں۔''[1]

دوسرے یہ کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں خصوصی طور پر حکم ہے کہ ان کے بارے میں نازیبا الفاظ استعمال نہ کیے جائیں۔ حدیث گزر چکی ہے۔ تیسرے یہ کہ ہمیں حکم ہے:

((أُذْكُرُوا مَحَاسِنَ مَوْتَاكُمْ)).

''اپنے فوت شدگان کی خوبیاں بیان کیا کرو۔''[2]

اب بھی اگر کوئی بدنصیب شخص ایسی جسارت کرتا ہے تو وہ ایک طرف تو حرام کا ارتکاب کر رہا ہے اور دوسری طرف حکم کو ترک کر رہا ہے۔ یعنی شریعت کے بالکل الٹ چل رہا ہے۔

ـ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو امت میں سے سب سے افضل حیثیت دیں اور اسی کے مطابق ان کا ادب واحترام کریں۔

ـ ان کے لیے بخشش طلب کرتے رہیں اور ان کے بارے میں اپنے دلوں میں کوئی بغض، دشمنی یا کینہ نہ رکھیں۔ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی علامت بتائی ہے کہ

[1] صحيح البخاري، حديث:1393۔ [2] سنن أبي داود، حديث:4900.

﴿وَالَّذِينَ جَاءُوا مِن بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِّلَّذِينَ آمَنُوا﴾

''اور جو ان کے بعد آئے ہیں وہ کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہمیں بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی بخش دے جو ایمان (لانے) میں ہم سے سبقت لے گئے اور ایمان لانے والوں کے متعلق ہمارے دلوں میں کوئی کینہ نہ رکھ۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿يَوْمَ لَا يُخْزِي اللَّهُ النَّبِيَّ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ﴾

''اللہ تعالیٰ روزِ قیامت نبی کریم ﷺ اور ان کے ساتھ ایمان لانے والوں کو رسوا نہیں کرے گا۔''[2]

لہٰذا جنھیں آخرت میں عزت ملے گی انھیں دنیا میں بھی رسوائی سے بچایا جائے گا کیونکہ آخرت میں عزت کی بنیاد دنیوی زندگی ہی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مکمل ادب و احترام کرنے کی اور ان کی شان و عظمت پہچاننے کی توفیق دے اور ان کا ساتھ نصیب فرمائے۔ آمین

[1] الحشر 10:59۔ [2] التحریم 8:66.

ائمہ، محدثین اور فقہائے کرام رحمہم اللہ کا ادب واحترام

ائمہ کرام اور محدثین عظام وہ ہستیاں ہیں جنھوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد دین کی آبیاری کی، دین کی حفاظت کی اور اسے اگلی نسلوں تک منتقل کیا۔ اس ساری کدوکاوش میں ان کا خلوص، ان کے جذبات اور نیکی کا رجحان غالب تھا۔ زمانۂ نبوت جوں جوں گزرتا گیا امت میں اسی تناسب سے تبدیلی آتی رہی۔ بہرکیف یہ حضرات حدیث کے مطابق خیرالقرون سے تعلق رکھتے ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((خَيْرُ النَّاسِ قَرْنِي، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ)).

''بہترین دور میرا ہے، پھر جو میرے دور سے متصل ہوگا، اس کے بعد وہ بھی بہتر ہے جو اس سے متصل ہوگا۔''[1]

دراصل اس حدیث مبارکہ میں تین ادوار کے سلف صالحین، ائمہ دین، مجتہدین، فقہاء اور محدثین سبھی شامل ہیں۔ متأخرین بہت سے مواقع پر انھی کے اقوال کی روشنی میں کسی فیصلہ کن مرحلے میں پہنچتے ہیں اور امت نے بالعموم ان کی فوقیت کو تسلیم کیا ہے۔ آج بھی ان ہستیوں میں سے کسی کا نام، کام یا فرمان نظر سے گزرتا ہے تو انھیں

[1] صحيح البخاري، حديث:3651.

خراج تحسین پیش کیے بغیر آگے گزرنا مشکل ہوتا ہے۔ ائمہ دین میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے عہد میں کارہائے نمایاں انجام دیے اور امت کو علم حدیث اور فقہ سے متعارف کرایا، اصول حدیث وضع کیے اور دین کو ہر لحاظ سے تحفظ فراہم کیا۔ ان کی کاوشوں کو ہمیں کشادہ ظرفی سے قبول کرنا چاہیے۔ اور ان کے ادب و احترام کا خیال رکھنا چاہیے۔

ان ائمہ و محدثین میں سے کئی تو وہ ہستیاں تھیں جن کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش گوئی فرمائی تھی:

((لَوْ كَانَ الْإِيمَانُ عِنْدَ الثُّرَيَّا لَنَالَهُ رِجَالٌ مِنْ هٰؤُلَاءِ)).

''اگر ایمان ثریا پر بھی ہو تو بھی سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی قوم کے کچھ لوگ اسے حاصل کرلیں گے۔''[1]

یہ انھی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ آج ہمارے پاس حدیث مبارکہ کی سیکڑوں کتب، ان کی شروحات اور تعلیقات موجود ہیں۔ اور امت کے پاس ایسا علمی ذخیرہ ہے کہ دوسری کوئی بھی امت اس سے محروم ہے۔ امت کو اس ممتاز مقام پر لا کھڑا کرنے میں اللہ کے فضل کے بعد ہمارے سلف صالحین اور ائمہ دین کی کاوشیں ہیں۔

ان میں جو اختلاف رونما ہوئے وہ ہمارے آج کے سطحی اور تعصب پر مبنی اختلافات کی طرح نہیں تھے۔ ان کے اختلافات اپنے اپنے فہم یا پھر کئی نصوص سے عدم واقفیت کی بنیاد پر تھے۔

لہٰذا اقوال اور فتاوی میں اختلاف کے باوجود ان کا ادب و احترام اور ان کا دفاع ہماری ضرورت ہے۔

[1] صحیح مسلم، حدیث: 2546 .

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور ائمہ کرام رحمہم اللہ کا دفاع

اس بارے میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ایک کتابچہ تحریر کیا ہے جس کا نام ہے:

((رَفْعُ الْمَلَامِ عَنِ الْأَئِمَّةِ الْأَعْلَامِ)).

''جلیل القدر ائمہ کے بارے میں مختلف شبہات کا ازالہ''

اس میں انھوں نے ائمہ کرام رحمہم اللہ کی طرف سے بظاہر کسی خلافِ سنت قول کے تین بنیادی اسباب ذکر کیے ہیں:

1. ائمہ کرام کو یہ علم نہ ہو کہ واقعی یہ قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔
2. فلاں حدیث مبارکہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد فلاں تھی۔
3. یا پھر خلافِ سنت فتوی دینے والے کسی امام کو یہ یقین ہوتا ہے کہ فلاں حکم منسوخ ہے۔

بعد ازاں شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے ان تین بنیادی اسباب کو حسب ذیل دس (10) اقسام میں بیان کیا ہے:

1. حدیث ان کے پاس پہنچی نہ ہو: اور جس شخص تک حدیث نہ پہنچی ہو وہ اس بات کا مکلف نہیں ہے کہ وہ اس حدیث کے تقاضوں سے آشنا ہو۔ اور جب اسے حدیث کا پتا ہی نہیں اور وہ ایک معاملے میں کسی آیت یا دوسری کسی حدیث یا...... استصحاب الحال[1] ...... کی روشنی میں کچھ کہہ دیتا ہے تو اس کا یہ قول یا فتویٰ کبھی اس حدیث کے موافق بھی ہو جاتا ہے اور کبھی مخالف بھی۔ سلف صالحین کے اقوال میں جو کسی حدیث کی مخالفت نظر

[1] استصحاب الحال: کی تعریف اصول فقہ کی روشنی میں یہ ہے کہ کسی مجتہد کے پاس کسی مسئلے میں کوئی دلیل نہ ہو تو یہی دلیل کا مفقود ہونا ہی اس مسئلے کے جواز یا عدم جواز کی دلیل بن جاتا ہے۔ حال سے یہاں مراد اصل ہے۔ (شرح نظم الورقات للشیخ العثیمین، ص:211) یعنی کسی مسئلے کی اصل کا اعتبار کرتے ہوئے دیکھا جائے گا۔

آتی ہے غالب حد تک اس کا سبب یہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ احادیث مبارکہ مکمل طور پر کسی ایک شخص کی نظر میں نہیں ہو سکتیں۔ اس کے بعد شیخ الاسلام نے عہد خلفائے راشدین کے متعدد واقعات ذکر کیے ہیں کہ انھیں فلاں فلاں موقع پر حدیث کا علم نہیں تھا۔

بعدازاں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: کوئی شخص ہرگز یہ بات نہ کہے کہ احادیث کی تدوین ہو چکی تھی اور مجموعے تیار ہو چکے تھے، لہٰذا اس صورتِ حال میں احادیث کا مخفی رہ جانا ممکن نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دواوین سنت ان ائمہ کرام رحمہم اللہ کا عہد گزر جانے کے بعد وجود میں آئے۔

2 پہنچنے والی حدیث ان کے نزدیک ثابت نہ ہو، یعنی حدیث ان تک پہنچی تو ہو مگر ان کے نزدیک ثابت نہ ہو۔ یا تو ان کے شیخ یا شیخ کے شیخ یا سند کے دوسرے راوی ان کے نزدیک مجہول ہوں، متہم ہوں، یا ان کا حافظہ کمزور ہو یا سند متصل نہ ہو یا بعینہ ان الفاظ سے انھیں حدیث نہ پہنچی ہو۔

3 وہ اپنے اجتہاد کی بدولت حدیث کو ضعیف سمجھتے ہوں اور اس کے علاوہ حدیث کی دوسری سند بھی ہو، خواہ ان کا موقف درست ہو یا دوسرے کسی محدث یا امام کا یا پھر دونوں ہی کا درست ہو۔ اس کے شیخ الاسلام نے کئی اسباب ذکر کیے ہیں۔

4 ان ائمہ میں سے کسی نے عادل، حافظ اور اکیلے راوی سے پہنچنے والی حدیث میں ایسی شرائط رکھی ہوں جس میں انھوں نے دوسری کی مخالفت کی ہو جیسا کہ بعض نے حدیث (کے صحیح ہونے) کے لیے کتاب وسنت پر پیش کرنے کی شرط لگائی ہے، بعض نے محدث کے فقیہ ہونے کی شرط لگائی ہے اور بعض نے عمومی طور پر پیش آمدہ معاملات میں حدیث کے عام اور شائع ہونے کی شرط بھی لگائی ہے۔

5 حدیث تو انھیں پہنچی ہو اور ان کے نزدیک وہ ثابت بھی ہو مگر وہ بھول گئے ہوں۔

جیسا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کا غسل جنابت کے موقع پر پانی کی عدم دستیابی والا معروف واقعہ ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ خود یہ واقعہ پیش آیا مگر انھوں نے فتویٰ اس کے خلاف دے دیا۔ عمار رضی اللہ عنہ نے انھیں یاد بھی دلایا مگر انھیں یاد نہ آیا۔[1]

اسی طرح سیدنا عمر رضی اللہ عنہ خطبہ دے رہے تھے۔ اس دوران انھوں نے یہ حکم جاری کر دیا کہ جو بھی شخص نبی کریم ﷺ کی ازواج یا صاحبزادیوں سے زیادہ حق مہر مقرر کرے گا میں اسے واپس کر دوں گا۔ ایک خاتون کہنے لگیں: امیر المؤمنین! اللہ تعالیٰ نے جو حق ہمیں دیا ہے آپ ہمیں اس سے محروم نہ کریں اور اس خاتون نے یہ آیت بھی تلاوت کی:

﴿وَاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا﴾

''اور تم عورتوں میں سے کسی کو خزانہ بھی دے چکے ہو......''

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فوراً اپنے حکم سے رجوع کر لیا۔[2]

آیت مبارکہ کا انھیں علم تھا مگر وہ موقع پر یاد نہ آئی۔ سلف و خلف میں اس قسم کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔

6 بسا اوقات حدیث مبارکہ میں کوئی غیر معروف اور غیر واضح لفظ آجاتا ہے اور اس امام کی اس لفظ سے صحیح شناسائی نہیں ہو پاتی۔ مثال کے طور پر بیوع (تجارت) کی احادیث میں ''مزابنہ'' محاقلہ''، ''مخابرہ'' اور ملامسہ'' وغیرہ کے الفاظ ہیں، علماء نے ان کی تفسیر میں اختلاف کیا ہے۔ اسی طرح مرفوع حدیث ہے:

((لَا طَلَاقَ وَلَا عِتَاقَ فِي إِغْلَاقٍ)).

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 338، وصحيح مسلم، حديث: 368۔ [2] سنن سعيد بن منصور: 1/166-167: 598.

''''اغلاق'' میں طلاق ہوتی ہے نہ غلامی سے آزادی۔'' [1]

یہاں اغلاق کے معنی ''اکراہ'' (زبردستی / مجبوری) کے کیے گئے ہیں مگر بعض اس توضیح کو درست نہیں سمجھتے۔

بعض اوقات لغوی معنی کچھ اور ہوتے ہیں، جبکہ نبوی مفہوم کچھ اور ہوتا ہے لیکن کوئی امام لغت والا مفہوم ہی اخذ کر لیتا ہے۔ اور کبھی ایک لفظ دو معانی کے درمیان مشترک ہوتا ہے یا مجمل یا پھر حقیقت اور مجاز دونوں پہلوؤں کو لیے ہوتا ہے، مگر وہ امام اس مفہوم کو لے لیتا ہے جو اس کے ہاں قریب تر ہو، خواہ اس سے مراد وہ مفہوم ہو جس کو انھوں نے چھوڑا ہے۔ جیسے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے الخيط الأبيض اور الخيط الأسود (سفید اور سیاہ دھاگے) سے مراد دھاگا ہی لے لیا۔ اور اسی طرح بعض صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم (آثارِ وضو کی چمک بڑھانے کے لیے) بازوؤں کو بغلوں تک دھونے لگے۔

کئی دفعہ نصوص کا مفہوم یا دلالت پوشیدہ ہوتی ہے۔ اور نصوص و فرامین میں دلالت کی جہتیں متعدد ہوتی ہیں۔ اہل علم ان کے فہم و ادراک میں مختلف نظر آتے ہیں۔ اور کلام کو اللہ کی عطا کردہ توفیق کے مطابق ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ اور بعض اوقات ایک شخص کلام سے وہ مفہوم لے لیتا ہے کہ لغت اس کا ساتھ نہیں دے رہی ہوتی۔

7 کسی امام کا یہ نظریہ ہو کہ حدیث میں فلاں دلالت ہے ہی نہیں، یعنی فلاں مسئلہ ثابت ہی نہیں ہوتا۔ اس قسم اور اس سے پہلی قسم میں فرق یہ ہے کہ پہلی قسم میں انھیں وجہ دلالت ہی کا علم نہیں ہوتا، جبکہ دوسری صورت میں وجہ دلالت کا علم تو ہوتا ہے لیکن وہ سمجھتا ہے کہ حدیث کی اس طرف دلالت اور راہنمائی درست نہیں ہے۔ اس کا باعث یہ ہے کہ ان کے کوئی ایسے اصول ہوں جو اس دلالت کی تردید کرتے ہوں، خواہ

[1] مسند أحمد: 276/6.

بجائے خود وہ اصول درست ہوں یا غلط۔

8 وہ امام یہ نظریہ رکھتے ہوں کہ حدیث کی ان متعدد دلالتوں سے متعارض کوئی اور دلائل ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مذکورہ دلالتیں مراد نہیں ہیں جیسے عام کا خاص سے، مطلق کا مقید سے، امر مطلق کا ایسے دلائل سے جو امر مطلق کے وجوب کی نفی کرتے ہوں اور حقیقت کا ایسے دلائل سے تعارض ہو جو مجاز کی طرف راہنمائی کرتے ہیں۔ یہ بھی بہت وسیع باب ہے۔ فرامین کی دلالتوں اور ان میں سے ایک دوسرے پر ترجیح ایک گہرا سمندر ہے۔

9 کسی امام کا یہ نظریہ ہو کہ فلاں حدیث کے مقابلے میں ایسے دلائل ہیں جو اس کے ضعیف ہونے، منسوخ ہونے یا تاویل کے قبول ہونے کی صورت میں اس کی تاویل پر دلالت کرتے ہیں۔ وہ دلائل بھی بالاتفاق تسلیم کیے جاتے ہوں۔ جیسا کہ کوئی آیت، حدیث یا اجماع ہو۔

اس کی دو قسمیں ہیں:

(ا) تاویل، تنسیخ یا ضعیف ہونے میں سے کوئی ایک سبب ہو مگر سبب کا تعین نہ ہو۔

(ب) اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تعین بھی کر دے کہ فلاں حدیث منسوخ ہے یا قابل تاویل ہے مگر وہ امام منسوخ قرار دینے میں کبھی غلطی بھی کر جاتا ہے کہ وہ بعد والی حدیث کو پہلے کی سمجھ لے۔ اسی طرح تاویل میں بھی غلطی ممکن ہے۔

10 حدیث کی مخالفت کے مذکورہ تین وجوہ میں سے کوئی ایک تو ہو مگر ضعیف، منسوخ یا قابل تاویل اس لحاظ سے قرار دے کہ ان کے علاوہ دیگر ائمہ اس حدیث کو قابل تعارض سمجھتے ہی نہ ہوں یا وہ حقیقت میں بھی غیر متعارض ہی ہے۔ جیسا کہ اکثر اہل کوفہ حدیث صحیح کو قرآن مجید کے ظاہر کے مقابلے میں لاتے ہیں۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ ان دس اسباب کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: مگر ہم اگر اس صورت حال کو اپنے لیے جائز سمجھیں تو یہ درست نہیں کہ ہم حدیث صحیح کے بالکل واضح ہو جانے کے بعد راہ حق سے ہٹیں ...... پھر فرماتے ہیں: تو جب کوئی صحیح حدیث آجائے اور اس میں (کسی چیز کو) حلال یا حرام قرار دیا گیا ہو یا اس میں کوئی حکم دیا گیا ہو تو ہم نے مذکورہ (10) اسباب کے تحت جن علماء کا ذکر کیا ہے انھیں اس حوالے سے مجرم نہیں ٹھہرایا جائے گا کہ انھوں نے حرام کو حلال یا حلال کو حرام قرار دے دیا ہے یا اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہیں دیا۔ اور اسی طرح حدیث میں کسی کام کے کرنے پر لعنت، غضب یا عذاب کی وعید ہے تو جس عالم نے ان میں سے کوئی کام کیا یا اسے مباح قرار دیا تو اس عالم کو اس وعید کا مستحق سمجھنا جائز نہیں۔ یہ وہ معاملہ ہے کہ اس کے بارے میں بعض معتزلہ کے سوا ہمیں امت میں سے کسی کے متعلق کسی اختلاف کا علم نہیں۔

بعدازاں شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے اسی رسالے کے صفحہ 34 سے ائمہ مجتہدین کو وعید کا نشانہ بنانے پر ممکنہ اعتراض کے 12 جوابات دیے ہیں۔

دعوت فکر

شیخ الاسلام رحمہ اللہ کی یہ ایک عمدہ کاوش ہے۔ اس کے پیش نظر ہمیں اپنے سلف صالحین کے مقام و مرتبے کا علم ہونا چاہیے اور ان سے محبت اور پیار ہونا چاہیے۔ اس کے لیے ان کا ادب و احترام بھی ضروری ہے۔

ہم میں سے اگر کسی کو واضح نصوص کی روشنی میں سلف صالحین میں سے کسی کے قول سے اختلاف نظر آتا ہے تو اس کا مطلب قطعاً یہ نہیں ہے کہ ہم ان کے بارے میں غلط

نظریہ رکھیں یا انھیں برا بھلا کہیں یا ان کا ادب واحترام نہ کریں۔

آج کوئی طالب علم کسی مختلف فیہ مسئلے میں چند احادیث یاد کر لیتا ہے تو بغیر سوچے سمجھے اس امت کے پہلے لوگوں پر تنقید شروع کر دیتا ہے۔ معصوم عن الخطا صرف انبیاء علیہم السلام ہی ہیں۔ مگر اجتہاد میں غلطی لگنے پر بھی ایک اجر تو ملتا ہے لیکن بعد والوں کا یہ رویہ کسی صورت بھی درست نہیں۔

ائمہ دین اور محدثین کرام رحمہم اللہ کا ادب واحترام کیوں؟

علم کی فضیلت کی تمام آیات اور احادیث اسی طرح اہل علم کے تمام فضائل و مناقب اگر پندرہویں صدی کے لوگوں پر فٹ آتے ہیں تو پہلی یا دوسری صدی کے ائمہ ومحدثین پر یہ کیوں نہیں فٹ آتے۔ اگر آج کے علماء انبیائے کرام علیہم السلام کے وارث ہیں تو ثم الذین یلونھم کے اعزاز والے لوگ کیوں اس میں شامل نہیں؟ اگر یہ اختلاف حدیث کے فہم کے حوالے سے ہے تو آج بھی ایسا ہی ہے۔ کوئی عالم ایک حدیث سے کچھ مطلب لیتا ہے اور دوسرا کوئی اور بلکہ فہم کا یہ اختلاف ایک ہی مکتب فکر کے علماء میں بھی پایا جاتا ہے، ایسے اختلافات میں ہم جو جوابات ایک ہی مکتب فکر کے علماء کا تحفظ کرنے کے لیے دیتے ہیں اس سے کہیں بڑھ کر سلف صالحین کے تحفظ کی کوشش کی جائے۔ اوران کا تحفظ کیا جائے۔ ائمہ ومحدثین یا راویانِ حدیث پر جس قدر بھی جرح ہوئی ہو، دیکھنا یہ ہے کہ ان پر جرح کرنے والے بھی تو بہت عظیم لوگ تھے اور وہ مجروح ائمہ، محدثین یا فقہاء بھی آج کے وارثانِ منبر ومحراب سے بدر جہا بہتر تھے۔ اگر اصول حدیث کی کڑی شرائط پر آج کے بڑے بڑے ''اساطین علم'' اور علامہ وفہامہ صاحبان کو پرکھا جائے تو شاید ہی کوئی ایک پورا اتر سکے۔ مگر امت

کے پہلے لوگوں کو ہدف تنقید بنانا مشغلہ بن چکا ہے۔

اسی طرح اپنی اپنی طرف سے کسی کو محض محدث قرار دے دینا اور کسی کو محض فقیہ، یہ بھی ان عظیم ہستیوں کا سوئے ادب ہے۔ ہمارے ہاں عمومی طور پر محدثین کرام کو پنسار سٹور اور فقہائے کرام کو طبیب کی مثال سے واضح کیا جاتا ہے کہ محدثین کرام نے محض احادیث جمع کیں مگر مسائل کا استخراج و استنباط اور استدلال ائمہ فقہاء نے کیا ہے، حالانکہ ایسی بات نہیں تھی۔ محدثین کرام رحمہم اللہ نے جس ترتیب سے اپنی کتب ترتیب دی ہیں اور ابواب قائم کیے ہیں وہی ان کی اعلیٰ فقاہت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ وہ سب ہی اپنی اپنی صلاحیتیں دین اسلام پر قربان کرتے رہے۔ وقت نے ان سے جو طلب کیا انھوں نے اسی سے اسلام کا دامن بھر دیا۔

اسی طرح اگر کسی راوی پر اصول حدیث کے اعتبار سے کوئی جرح ہے تو اس کا مطلب قطعاً یہ نہیں کہ اس کے بارے میں ہمیں غیر پارلیمانی زبان استعمال کرنے کا حق مل گیا ہے، حالانکہ وجہ ضعف مختلف نوعیت کی ہوتی ہے۔ دین کی اعلیٰ خدمت کے صلے میں اگر ان ہستیوں کو طعن و تشنیع کا نشانہ دین دار ہی بناتے رہیں گے تو معاشرے سے ان کا ادب و احترام بھی اٹھتا چلا جائے گا۔ ''جیسا کرو گے ویسا بھرو گے'' کا قانون تو جاری ہوتا ہی ہے۔ اسی لیے جن لوگوں نے سلف صالحین کا ادب و احترام نہیں کیا آج انھیں بھی ادب و احترام نہیں دیا جاتا اور خود ان کے ہم خیال بھی ان کا ادب و احترام نہیں کرتے۔ اور نہ جانے ہمارے بعد والے ہمیں کن الفاظ سے یاد کریں گے۔

ائمہ و محدثین رحمہم اللہ کے کارنامے اور اعزازات

الغرض ائمہ و محدثین نے اس دین کی ترویج و اشاعت میں بھرپور کردار ادا کیا۔ اور

کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔

- ورثہ نبوت کو بعد والی نسلوں تک منتقل کرنے والے یہی عظیم لوگ تھے۔
- انھیں زبان نبوت سے ''ثم الذین یلونھم'' کا اعزاز نصیب ہوا تھا۔
- اور بھی کئی پیش گوئیاں ان عظیم ہستیوں پر صادق آتی ہیں۔
- یہ ہمارے سلف صالحین ہیں۔ اپنے پہلے لوگوں کا احترام بہر حال ضروری ہوتا ہے۔
- ان کے اختلاف کی نوعیت تعصّبانہ نہیں تھی۔
- اصول حدیث کی روشنی میں اگرچہ ان میں سے کئی ایک مجروح ہوں مگر پھر بھی وہ بدر جہا بہتر تھے۔
- وہ معصوم عن الخطا نہیں تھے، وہ بشر تھے۔ ان سے کسی ایسی بات کا سرزد ہو جانا کوئی بعید نہیں۔
- انھیں اجتہاد کا حق حاصل تھا۔ اگر اجتہاد میں غلطی بھی ہوئی پھر بھی وہ عنداللہ ماجور ہیں۔

ائمہ و محدثین رحمہم اللہ کے ادب و احترام کی صورتیں

- تمام ائمہ و محدثین کا نام ادب و احترام سے لیں اور لکھیں۔ اور ان کے لیے بخشش و رحمت اور درجات کی بلندی کی دعائیں کریں۔
- قرآن و سنت کی ترویج و اشاعت اور تفہیم و اجتہاد میں ان کی قابل قدر کوششوں کا تذکرہ اپنے اپنے حلقے میں کریں۔
- اگر کوئی امام کسی خاص گروہ کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے طعن و تشنیع کا نشانہ بن چکا ہے تو ایسی روش سے باز آنا چاہیے۔
- ائمہ نے بعض دفعہ ایسی باتیں کی نہیں ہوتیں مگر ان کی طرف منسوب ہو جاتی ہیں۔

اس لحاظ سے انھیں مطعون ٹھہرانا قرین انصاف نہیں۔

ـ سلف صالحین کا فہم کئی اسباب کی بنا پر بہتر تھا، اس لیے انھی کی سمجھ بوجھ کو ترجیح دیں۔لیکن کسی ایک امام کو خاص کر لینا درست نہیں۔ جملہ ائمہ و محدثین کے فہم سے استفادہ کرنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو محدثین کرام اور ائمہ دین رحمہم اللہ کی محبت اور ان کا ادب و احترام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین

باب : 10

اولیائے کرام رحمہم اللہ کا ادب واحترام

اولیائے کرام رحمہم اللہ کے ادب واحترام سے قبل یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ اولیاء کون ہوتے ہیں۔ قرآن وسنت میں اگر اولیاء اللہ کے فضائل ومناقب بیان ہوئے ہیں تو یہ بھی تو بیان ہوا ہوگا کہ ولی کون ہوتا ہے۔ آیئے یہ جانتے ہیں۔

ولی کی تعریف......قرآن وسنت کی روشنی میں

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ﴾

”متنبہ رہو! یقیناً اولیاء اللہ پر کوئی خوف ہے نہ وہ غم کریں گے۔ (اولیاء) وہ ہیں جو ایمان لائے اور انھوں نے تقویٰ اختیار کیا۔“[1]

اسی طرح فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ﴾

[1] یونس 10:62-63.

''بے شک جن لوگوں نے کہا: ہمارا رب اللہ ہے، پھر اس پر استقامت اختیار کی ان پر فرشتے اترتے ہیں (اور کہتے ہیں:) نہ خوف کرو اور نہ غم کرو اور تمھیں جنت کی خوشخبری ہو جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ ہم دنیا میں بھی تمھارے دوست تھے اور آخرت میں بھی تمھارے دوست ہیں۔''[1]

اور پھر فرمایا:

﴿فَاَقِیْمُوا الصَّلَاۃَ وَاٰتُوا الزَّکَاۃَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰہِ ھُوَ مَوْلَا کُمْ﴾

''چنانچہ تم نماز قائم کرو اور زکاۃ ادا کرتے رہو اور اللہ (کے دین) کو مضبوطی سے تھام لو، وہی تمھارا دوست ہے۔''[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ اللہ عزوجل فرماتے ہیں:

((وَمَا تَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدِي بِشَيْءٍ أَحَبَّ إِلَيَّ مِمَّا افْتَرَضْتُهُ عَلَيْهِ)).

''میں نے اپنے بندے پر جو کچھ فرض قرار دیا ہے اسے ادا کرنے سے زیادہ بہتر اور کوئی طریقہ نہیں جس کے ذریعے بندہ میرا قرب حاصل کر سکے۔''[3]

ان نصوص کی روشنی میں ہم بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ حسب ذیل خوبیوں کا حامل شخص اللہ تعالیٰ کا ولی ہوتا ہے:

- وہ ایمان سے سرشار ہو۔ اور ایمان کے مفہوم میں اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، جنت، جہنم پر اور تقدیر پر ایمان لانا شامل ہے، جیسا کہ حدیثِ جبریل میں ہے۔
- ولی متقی ہوتا ہے۔ تقویٰ کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ کا ایسا

[1] حم السجدة 41:30-31۔ [2] الحج 22:78۔ [3] صحيح البخاري، حديث:6502.

خوف جاگزیں ہو کہ وہ اس کے کسی حکم کی تعمیل سے پیچھے نہ رہے اور کسی بھی ممنوع کام سے حتی المقدور بچنے کی پوری کوشش کرے۔

- وہ یہ اظہار بھی کرے کہ ہمارا رب ایک اللہ ہے۔
- استقامت اختیار کرے اور شرک سے مکمل طور پر بچے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا ابودرداء رضی اللہ عنہ کو وصیت فرمائی تھی:

((لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ شَيْئًا وَّإِنْ قُطِّعْتَ وَحُرِّقْتَ)).

''اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا خواہ تمھیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے یا جلا دیا جائے۔''[1]

- نماز قائم کرتا ہو۔
- زکاۃ ادا کرتا ہو، شریعت میں زکاۃ کا جو نصاب مقرر ہے اسے خود بھی ادا کرنا اور دوسروں کو بھی تلقین کرنا۔
- اللہ کے دین پر کاربند رہنا۔ یہی اعتصام باللہ ہے۔
- اللہ تعالیٰ نے جن احکام کو فرض قرار دیا ہے اور مقرر فرمایا ہے ان کی بجا آوری کر کے تقرب الٰہی حاصل کرنا۔
- فرائض کے ساتھ ساتھ نوافل کا بھی اہتمام کرنا۔

ولی دوست کو کہتے ہیں۔ اس وجہ سے محبت اور قرب ولایت کا لازمی عنصر ہے۔ اور اللہ کے قرب اور محبت کے حصول کا اس کی طرف سے مقرر کردہ ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے اتباعِ سنت۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

[1] سنن ابن ماجه، حديث: 4034.

﴿قُلْ إِنْ كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ﴾

''اے پیغمبر کہہ دیں: اگر تم اللہ کی محبت چاہتے ہو تو میرا اتباع کرو اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا۔''[1]

الغرض! اتباع سنت کے بغیر اللہ کی محبت نہیں مل سکتی۔ یا اس طرح کہہ لیں کہ کوئی شخص اتباع سنت کے بغیر ولی نہیں بن سکتا۔

ولی کی خود ساختہ تعریف

یہ تو تھی قرآن وسنت کی روشنی میں ولی کی تعریف۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور سلف صالحین رحمہم اللہ نے مقام ولایت اسی شرعی راستے سے حاصل کیا تھا۔ ان کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ تھا اور نہ کوئی سلسلہ کوئی خانقاہ تھی اور نہ کوئی آستانہ، کوئی گدی تھی اور نہ کوئی دروازہ۔

لیکن یہاں کچھ لوگوں نے اپنی مرضی سے بھی ''ولی'' کی تعریف کی ہے۔ آستانوں، سلسلوں، دروازوں اور گدیوں سے منسلک لوگ ''ولی'' کی تعریف کچھ یوں کرتے ہیں کہ مجذوبانہ حالت ہو، لوگوں کے رحم وکرم پر اس کا جینا ہو، طہارت و نظافت کا بالکل خیال نہ رکھتا ہو، دنیا سے کٹا ہوا ہو، عبادت کی ضرورت نہ ہو، سب کچھ دل ہی دل میں کرتا ہو۔ پھر وہ اس پر حدیث سے دلائل بھی دیتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

((إِنَّ مِنْ عِبَادِ اللَّهِ مَنْ لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللَّهِ لَأَبَرَّهُ)).

''اللہ کے کچھ بندے ایسے بھی ہیں کہ اگر وہ اللہ پر قسم بھی ڈال دیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم پوری فرما دیتے ہیں۔''[2]

[1] آل عمران 3:31۔ [2] صحیح البخاري، حدیث:2703.

کئی ''اہل علم'' اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے خود کار اولیاء کو اللہ کا شریک ٹھہرانے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔

مگر انھیں اس بات کا علم نہیں کہ سیدنا انس بن نضر رضی اللہ عنہ جن کی بابت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مذکورہ ارشاد فرمایا تھا۔ کیا ایسے ''اولیاء'' ان کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ آیئے! ہم ان کے بارے میں ان کے بھتیجے سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا صحیح بخاری میں مذکور بیان پڑھتے ہیں:

''سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ بے شک ان کے چچا انس بن نضر رضی اللہ عنہ غزوۂ بدر میں شریک نہ ہو سکے۔ اس پر ان کے جذبات یہ تھے: ''میں پہلی ہی جنگ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہیں جا سکا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ میں شرکت کا موقع دیا تو اللہ تعالیٰ دیکھے گا میں کس قدر بے جگری سے لڑتا ہوں، پھر غزوۂ احد میں شریک ہوئے ...... سیدنا سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ سے ملے اور کہنے لگے: سعد! آپ کہاں؟ بے شک میں تو جبلِ احد کے دامن میں جنت کی خوشبو پا رہا ہوں!! پھر آگے بڑھے اور جام شہادت نوش کر گئے۔ ان کی لاش مبارک پہچانی نہیں جا رہی تھی بالآخر ان کی بہن نے انھیں تل یا انگلیوں کے پوروں سے پہچانا۔ ان کے جسم پر نیزے، تلوار اور تیر کے قریباً اسّی (80) زخم تھے۔''[1]

کہاں جہاد کا یہ شوق، شہادت کا جذبۂ صادق اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی بجا آوری اور کہاں یہ ننگے تڑنگے، غبار آلود، فرائض کے تارک اور سنت کے باغی خود ساختہ پیر فقیر!

[1] صحيح البخاري، حديث:4048.

انھوں نے زیادہ سے زیادہ یہ کام کیا ہے کہ جہاد کے عنوان سے آنے والی آیات و احادیث کو اپنے اوپر فٹ کرنے کی سعی لا حاصل کی ہے اور جہاد کا منہ چڑایا ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے:

((رُبَّ أَشْعَثَ مَدْفُوعٍ بِالْأَبْوَابِ لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَأَبَرَّهُ)).

''کتنے ہی پراگندہ بالوں والے اور دروازوں سے دھتکارے ہوئے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اللہ پر قسم ڈال دیں تو اللہ ان کی قسم پوری فرما دیتا ہے۔''[1]

کئی لوگ تکلفاً اپنی حالت ایسی بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور غسل کو جرم تصور کرتے ہیں اور مجذوبانہ سی حالت بنا لیتے ہیں تاکہ احادیث میں بیان کردہ بشارت پالیں۔

دراصل اولیاء تکلفاً اپنی یہ کیفیت نہیں بناتے۔ نبی کریم ﷺ غسل بھی فرماتے تھے بلکہ آپ نے فرمایا:

((لِلّٰهِ تَعَالٰى عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ حَقٌّ أَنْ يَّغْتَسِلَ فِي كُلِّ سَبْعَةِ أَيَّامٍ يَوْمًا)).

''ہر مسلمان پر اللہ کا حق ہے کہ سات دنوں میں سے ایک دن وہ ضرور غسل کرے۔''[2]

حدیث کے الفاظ 'مَدْفُوعٍ بِالْأَبْوَابِ' سے بھی لوگوں نے غلط مفہوم لیا۔ اس کا مطلب ''ولیوں'' کے ہاتھوں میں کاسہ گدائی تھما کر گھر گھر سے باتیں سنوانا نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ گمنام سی زندگی گزارتے ہیں۔ لوگ انھیں جانتے نہیں انھیں اہمیت نہیں دیتے انھیں بٹھانا تو دور رہا لوگ دروازوں پر بھی انھیں دیکھنا پسند نہیں کرتے۔

[1] صحيح مسلم، حديث:2622۔ [2] صحيح البخاري، حديث:898۔

آپ ﷺ تیل بھی لگاتے تھے، کنگھی بھی کرتے تھے، خوشبو بھی لگاتے تھے اور طہارت کا بھی اہتمام فرماتے تھے۔ طہارت اور پاکیزگی کا اس قدر خیال فرماتے تھے کہ اسے ایمان کا حصہ قرار دیا۔ فرمایا:

((اَلطُّهُورُ شَطْرُ الْإِيمَانِ)).

"پاکیزگی ایمان کا حصہ ہے۔"[1]

اگر ہم اللہ تعالیٰ کے فرامین واحکام اور نبی کریم ﷺ کے فرامین کی روشنی میں ان "اولیا" کا جائزہ لیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے دونوں میں بُعدَ الْمَشْرِقَيْن ہے۔ البتہ ولی کی وہ تعریف جو تصوف پر لکھی گئی کتابوں میں درج ہے جیسے حلية الأولياء کے شروع میں متعدد صفات ذکر کی گئی ہیں جن میں سے کئی ایک ضعیف اور موضوع روایات کی بنیاد پر ہیں۔ "اولیا" کی ان صفات کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اولیاء کو اعزاز دینے کا وعدہ تو کیا ہے مگر اللہ تعالیٰ چاہتا نہیں کہ کوئی ولی بنے۔ کیونکہ وہ شرائط اس قدر کڑی ہیں کہ ان تمام شرائط کو پورا کرنا محال ہے ویسے بھی اگر انسان ان شرائط کو پورا کر کے طریقت کو اختیار کرے تو اسی قدر شریعت سے دور ہوتا چلا جائے گا۔ اس صورت میں یہ اولیاء اور صوفیاء دین کے متوازی ایک نقطہ نظر کے حامل نظر آتے ہیں۔

اولیائے کرام اور مزار

آج کل ولی اور مزار کو آپس میں ایسے جوڑ دیا گیا ہے کہ "ولی" کا لفظ سنتے ہی "مزار" کا تصور ابھرتا ہے۔ بلکہ ایسے "اولیا" مزار کی وصیت کرتے ہیں۔ نوبت بہ ایں

[1] صحیح مسلم، حدیث:223.

جاں رسید کہ جس کا مزار نہ ہو اسے ولی سمجھا ہی نہیں جاتا۔

نبی کریم ﷺ نے اپنی قبر کے متعلق دعا کی تھی:

((اَللّٰهُمَّ ! لَا تَجْعَلْ قَبْرِي وَثَنًا يُّعْبَدُ)).

''اے اللہ! میری قبر کو آستانہ نہ بنانا جس کی عبادت کی جائے۔'' [1]

اسی طرح واضح حدیث ہے:

((نَهٰى رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ أَنْ يُّجَصَّصَ الْقَبْرُ وَأَنْ يُّقْعَدَ عَلَيْهِ وَأَنْ يُّبْنٰى عَلَيْهِ)).

''رسول اللہ ﷺ نے قبر کو پختہ بنانے، اس پر بیٹھنے اور اس پر تعمیر کرنے سے منع فرمایا ہے۔'' [2]

سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے وفات سے قبل ورثاء کو دوسری وصیتوں کے ساتھ یہ وصیت بھی کی تھی کہ میری قبر پر کچھ تعمیر نہ کرنا۔ ورثاء نے پوچھا یہ آپ نے کس سے سنا ہے تو انھوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ سے۔ [3]

مگر دور حاضر کے اکثر ''اولیاء'' اس چیز پر راضی ہوتے ہیں کہ ان کا آستانہ بنے بلکہ بعض ''اولیاء'' تو زندگی ہی میں اپنا مقبرہ وغیرہ بنا لیتے ہیں کہ وفات کے بعد انھیں وہاں دفن کیا جائے۔ یا وصیت کر جاتے ہیں کہ میرا مزار بنانا۔ کوئی ولی ہے کہ نہیں، یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے مگر مذکورہ احادیث کی روشنی میں ''مزاروں'' کے متعلق تعلیمات واضح ہیں۔

[1] مؤطا إمام مالک، حدیث: 423۔ [2] صحیح مسلم، حدیث: 970۔ [3] مسند أحمد: 197/4.

کراماتِ اولیاء

جو لوگ واقعۃً اللہ کے ولی ہیں اللہ تعالیٰ ان کے ہاتھوں پر بعض اوقات خرقِ عادت امور (روٹین سے ہٹ کر امور) ظاہر کرتا ہے جنھیں اصطلاح میں کرامات کہا جاتا ہے۔ اور اگر کسی ایسے شخص سے خرقِ عادت امور سرزد ہو رہے ہیں جو شریعت کو خاطر میں نہیں لاتا تو یہ یقین کر لینا چاہیے کہ وہ کرامات نہیں بلکہ یا تو شعبدہ بازی ہے یا اسے شیطانوں اور جنوں کی تائید حاصل ہے۔ یا پھر وہ اللہ کی طرف سے استدراج (ڈھیل) ہے۔

قرآن و حدیث میں اولیاء کی جو علامات اور خوبیاں بیان ہوئی ہیں ان میں یہ علامت بیان نہیں ہوئی کہ اگر کرامت ظاہر ہو تو وہ ولی ہے وگرنہ نہیں۔ اور ویسے بھی کرامت پر بندے کا اپنا اختیار نہیں ہوتا کہ جب چاہے اسے ظاہر کر دے۔ اس طرح کتنے نیک لوگ ہوتے ہیں مگر ان سے کرامات ظاہر نہیں ہوتیں۔ لہٰذا یہ ضروری نہیں کہ اسے ہی ولی مانا جائے جو صاحب کرامت ہو۔

اولیائے کرام رحمہم اللہ کا ادب واحترام کیوں؟

حدیثِ قدسی ہے:

((مَنْ عَادٰی لِی وَلِیًّا، فَقَدْ آذَنْتُهُ بِالْحَرْبِ...)).

”جو میرے کسی ولی کے ساتھ عداوت رکھتا ہے میں اس سے اعلانِ جنگ کرتا ہوں۔ اور میرا بندہ جن جن عبادات سے میرا قرب حاصل کرتا ہے ان میں سے سب سے عزیز وہ عبادت ہے جسے میں نے فرض قرار دیا ہے۔ میرا بندہ نفلی عبادات کے ذریعے میرا اتنا قرب حاصل کر لیتا ہے کہ میں اسے محبوب بنا

لیتا ہوں، پھر میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے۔ اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے۔ اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا قدم بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔ وہ مجھ سے مانگتا ہے تو میں اسے دیتا ہوں۔ وہ مجھ سے پناہ طلب کرتا ہے تو میں اسے پناہ دے دیتا ہوں۔''[1]

اس کا مطلب یہ نہیں کہ نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ اس ولی کے ہاتھ، پاؤں اور آنکھیں بن جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ پھر ان اعضاء سے وہی کام لیتا ہے جو رضائے الٰہی کا باعث بنیں۔ اعضا اس کے ہوتے ہیں اور ان پر حکمرانی اللہ تعالیٰ کی چلتی ہے۔ ان اعضاء پر خواہشات کی حکمرانی سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ یعنی وہ خود اور اس کے تمام اعضاء اللہ کے بن جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس سے بہت بلند ہے کہ وہ کسی کا پاؤں یا ہاتھ بنے۔ تعالی اللہ عما یصفون۔

اسی طرح حدیث میں ہے:

((إِذَا أَحَبَّ اللّٰهُ الْعَبْدَ نَادٰى جِبْرِيلَ: إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ فُلَانًا فَأَحِبَّهُ. فَيُحِبُّهُ جِبْرِيلُ فَيُنَادِي جِبْرِيلُ فِي أَهْلِ السَّمَاءِ: إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ فُلَانًا فَأَحِبُّوهُ. فَيُحِبُّهُ أَهْلُ السَّمَاءِ. ثُمَّ يُوضَعُ لَهُ الْقَبُولُ فِي الْأَرْضِ)).

''جب اللہ تعالیٰ کسی سے محبت کرتا ہے تو جبریل علیہ السلام سے فرماتا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ فلاں شخص سے محبت کرتا ہے، لہٰذا تو بھی اس سے محبت کر تو جبریل اس

[1] صحيح البخاري، حديث:6502.

سے محبت کرتے ہیں، پھر وہ اہل آسمان میں صدا لگاتے ہیں: بے شک اللہ تعالیٰ فلاں شخص سے محبت فرماتے ہیں، لہٰذا تم بھی اس سے محبت کرو تو آسمان والے اس سے محبت کرتے ہیں، پھر زمین والوں میں بھی اس کی مقبولیت رکھ دی جاتی ہے۔" [1]

بعض اوقات برے کردار کے حامل لوگ حتی کہ غیر مسلم بھی بڑی مقبولیت حاصل کر جاتے ہیں مگر ان کی یہ مقبولیت ان کے فن یا حسن یا کسی اور اعتبار سے ہوسکتی ہے مگر یہ محبت یا مقبولیت زمین والوں ہی سے شروع ہوتی ہے اور یہیں ختم ہوجاتی ہے جبکہ اللہ کے محبوب بندوں کی محبت اللہ سے شروع ہوتی ہے اور آخر میں زمین والوں تک پہنچتی ہے۔

بہرحال ان احادیث سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اولیاء سے محبت کرنی چاہیے اور ان کا ادب و احترام بھی کرنا چاہیے۔ اور ان سے کسی قسم کی کوئی عداوت یا دشمنی نہیں رکھنی چاہیے کیونکہ ان کی دشمنی کو اللہ تعالیٰ نے اپنی دشمنی قرار دیا ہے۔

مگر بہت سے بہروپیوں میں سے ولی کو پہچاننا ایک مشکل کام ہے کیونکہ کوئی صاحبِ علم و فضل ہو اس کی پہچان ہو جاتی ہے۔ کوئی عمدہ اخلاق کا مالک ہو اس کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے مگر ولی کے لیے تقویٰ کی شرط ہے اور تقویٰ حکم کردہ امور کو ماننے اور منکرات کو ترک کرنے کا نام ہے، لہٰذا جو بھی مسلمان شریعت کی واقعی پابندی کرے تو اس کے متعلق ہم یہی اچھا گمان رکھیں گے اور اس سے محبت کریں گے اور اس کا ادب و احترام ضروری ہوگا۔ اور قرآن و سنت کی تعلیمات سے انحراف کرنے والے اور ان کی مخالفت میں زندگی گزارنے والے سے بچنا بھی حقیقی اولیاء کے احترام میں شامل ہے۔

[1] صحيح البخاري، حديث:3209.

احتیاط لازم ہے

انسانیت میں شرک بڑے لوگوں کی تعظیم واحترام کی وجہ سے نہیں بلکہ نیک لوگوں کی تعظیم واحترام میں غلو اور حد سے تجاوز کے باعث آیا تھا۔ نیک لوگوں کی وفات کے بعد ان کی مورتیاں بنائی گئیں تاکہ ان جیسی عبادت کی جائے، پھر آئندہ نسلوں نے ان جیسی کی بجائے انھی کی عبادت شروع کر دی اور رفتہ رفتہ شرک ان میں پھیلتا چلا گیا۔ اس وجہ سے اولیاء کے ادب واحترام میں احتیاط لازم ہے۔ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے:

((أُولٰئِكَ إِذَا مَاتَ مِنْهُمُ الرَّجُلُ الصَّالِحُ بَنَوْا عَلٰى قَبْرِهِ مَسْجِدًا ثُمَّ صَوَّرُوا فِيهِ تِلْكَ الصُّوْرَةَ ، أُولٰئِكَ شِرَارُ الْخَلْقِ عِنْدَ اللّٰهِ)).

”(پہلے) لوگ ایسے تھے کہ جب ان میں سے کوئی نیک آدمی فوت ہوتا تو وہ اس کی قبر پر مسجد بنا دیتے، پھر اس میں یہ مورتی یا تصویر بنا دیتے۔ وہ لوگ اللہ کے ناپسندیدہ ترین لوگ تھے۔“[1]

لوگوں کو شرک میں مبتلا کرنے میں شیطان کی کارستانیوں کے متعلق فرمایا:

”خبردار! میرے رب نے مجھے حکم فرمایا ہے...... اور بے شک میں نے اپنے بندوں کو توحید کا حامل ہی پیدا کیا تھا۔ ان کے پاس شیطان آتے رہے اور انھیں ان کے دین سے برگشتہ کرتے رہے اور جو میں نے ان پر حلال کیا تھا اسے حرام قرار دیتے رہے اور شیطانوں ہی نے ان سے کہا کہ وہ میرے ساتھ شریک ٹھہرائیں جس کی میں نے کوئی دلیل نہیں اتاری۔“[2]

اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے بارے میں فرمایا ہے:

---

(1) صحیح البخاري، حدیث:1341۔ (2) صحیح مسلم، حدیث:2865.

﴿إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ﴾

''بے شک میرے بندوں پر تیرا غلبہ نہیں ہوگا۔''[1]

اس لحاظ سے اولیاء اللہ کو بھی چاہیے کہ وہ توحید پر سختی سے پہرہ دیں اور حدیث نبوی کی روشنی میں یہ دعا بھی کریں کہ ان کی قبریں شرک کے فتنے سے محفوظ رہیں اور اونچی قبروں کو برابر کروا دیں۔

ابوالھیاج اسدی رحمہ اللہ کہتے ہیں: سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے مجھ سے کہا: کیا میں تجھے اس مہم پر روانہ نہ کروں جس پر مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا تھا۔ وہ مہم یہ تھی کہ:

((أَنْ لَّا تَدَعَ تِمْثَالًا إِلَّا طَمَسْتَهُ وَلَا قَبْرًا مُشْرِفًا إِلَّا سَوَّيْتَهُ)).

''کہ کوئی مجسمہ یا تصویر ہو تو اس کا نام ونشان مٹا دو اور ہر اونچی قبر کو برابر کر دو۔''[2]

مگر آج زیادہ تر اونچی قبریں اور مزارات انھی کے ہیں جو اپنے آپ کو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کرتے ہیں اور شاہ یا سید کہلاتے ہیں۔

اولیائے عظام کے ادب واحترام کی صورتیں

- ایک مسلمان اپنے دوستوں کا خیال رکھتا ہے۔ اللہ کے دوستوں کا اس سے کہیں زیادہ حق ہے کہ ان کا خیال رکھا جائے۔
- وہ زندہ ہوں یا اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہوں۔ ان سے اللہ کے لیے محبت کی جائے۔

[1] بني إسرآءيل 17:65۔ [2] صحيح مسلم، حديث:969.

- نام نہاد ''اولیاء'' کی آڑ میں حقیقی اولیاء پر ہرگز آنچ نہ آنے دی جائے۔ ایسا نہ ہو کہ کسی اللہ کے صحیح ولی سے دشمنی کا کوئی پہلو نکل آئے۔
- ان سے ملاقات کی سعادت حاصل کی جائے اور ان کی مجلس اختیار کی جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نیک شخص کے ساتھ بیٹھنے کی مثال کستوری والے اور برے ہم نشین کی مثال بھٹی دھونکنے والے سے دی ہے۔[1]

نیک لوگوں کے پاس جانے اور ان کی صحبت اختیار کرنے سے اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

- اولیاء اللہ سے دعا بھی کرانی چاہیے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پاس اہل یمن میں سے غازیانِ اسلام آتے تو آپ ان سے پوچھتے: ''کیا تم میں اویس بن عامر ہیں۔'' بالآخر ایک وفد میں اویس آ ہی گئے...... سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا ہے: ''تمھارے پاس اہل یمن کی فوجی کمک کے ساتھ اویس بن عامر آئیں گے...... اگر وہ اللہ پر قسم بھی ڈال دیں تو وہ ان کی قسم پوری فرما دے گا۔ اگر یہ ہو سکے کہ وہ تمھارے لیے بخشش کی دعا کریں تو ایسا ضرور کرنا۔'' چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بخشش کی دعا کرائی تو انھوں نے دعا کر دی۔[2]

سیدنا اویس قرنی رحمہ اللہ کا مجاہدین کی مدد کرنا، ماں کے ساتھ احسان کرنا، گمنامی کی زندگی کو ترجیح دینا اور مختصر سے ساز و سامان کے ساتھ گزارا کرنا ان کی نمایاں خوبیاں ہیں۔ کوئی مستجاب الدعوات بننے کا آرزومند ہے تو اسے ایسا کرنا چاہیے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اویس قرنی رحمہ اللہ کے آنے پر ان سے دعا کرانے کا حکم ارشاد فرمایا تھا۔ اسی لیے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ یمن سے آنے والے ہر قافلے میں اویس قرنی کی تلاش میں

[1] صحيح البخاري، حديث:5534۔ [2] صحيح مسلم، حديث:2542.

رہتے تھے۔اس سے آسان صورت تو یہ تھی کہ اپنی دعا میں سیدنا اویس قرنی رحمہ اللہ کا وسیلہ دے دیا جاتا یا پھر آپ علیہ السلام ان کی قبر کا بتا دیتے کہ ان کی تدفین فلاں جگہ ہوگی۔ تمام اہل اسلام جوق در جوق وہاں جا کر اللہ سے دعا کریں۔نہیں وہاں ایسا کوئی تصور نہیں تھا۔ یہ حدیث مبارکہ دعا میں کسی کا وسیلہ دینے کی یا کسی فوت شدہ کی قبر کے پاس جا کر اللہ سے دعا کرنے کی پوری صراحت سے نفی کر رہی ہے۔

ـ ایسے نیک لوگوں کے کام بھی آنا چاہیے جبکہ عموماً ایسے لوگوں کی کوئی ذاتی ضروریات ہوتی ہی نہیں۔ جیسا کہ عمر رضی اللہ عنہ نے اویس قرنی رحمہ اللہ سے ملاقات کے بعد پوچھا تھا: آپ کہاں کا ارادہ رکھتے ہیں؟ انھوں نے کہا: کوفہ کا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کہنے لگے: کیا میں وہاں کے عامل کو آپ کے لیے کچھ تحریر کر دوں؟ وہ کہنے لگے: مجھے گمنام اور نادار سے لوگوں میں رہنا زیادہ پسند ہے۔

ـ اولیاء اللہ کے واقعات کا ذکر اپنی مجالس میں کرنا چاہیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی اسرائیل کے بہت سے نیک لوگوں کے اچھے واقعات مختلف مواقع پر ذکر فرمائے۔ آپ علیہ السلام نے ایک واقعہ بیان فرمایا: ''پہلے لوگوں میں سے ایک شخص نے زمین خریدی تو اسے اس میں سے سونے کا ایک مٹکا مل گیا۔تو وہ زمین فروخت کرنے والے سے کہنے لگا: میں نے آپ سے زمین خریدی تھی، سونا نہیں۔ فروخت کرنے والا کہنے لگا: میں نے آپ کو زمین اور جو کچھ اس میں ہے سب کچھ فروخت کر دیا تھا، چنانچہ وہ دونوں اپنا فیصلہ کسی شخص کے پاس لے گئے۔ اس نے پوچھا: کیا تم دونوں کی اولاد ہے؟ ایک نے کہا: میرا بیٹا ہے۔ دوسرے نے کہا: میری بیٹی ہے۔ وہ کہنے لگا: تو تم دونوں بچے کی شادی بچی سے کر دو اور اس خزانے میں سے ان پر خرچ کر دو۔[1]

[1] صحيح البخاري، حديث:3472.

اسی طرح غار میں پھنس جانے والوں کے واقعے کا بھی آپ علیہ السلام نے ذکر فرمایا۔ وہ واقعہ مختصراً اس طرح ہے: تین آدمی سفر پر تھے۔ بارش ہوئی تو انھوں نے غار میں پناہ لے لی۔ ایک پتھر لڑھکتا ہوا غار کے دہانے پر ٹک گیا اور غار کا منہ مکمل طور پر بند ہوگیا۔ اب وہ اپنے اپنے نیک اعمال کی وساطت سے اللہ سے دعا کرنے لگے۔ ان میں سے ایک نے دعا کی: اللہ! میرے والدین عمر رسیدہ اور بچے چھوٹے تھے۔ میں جب بکریاں چرا کر لاتا تو بچوں سے پہلے والدین کی خدمت میں دودھ پیش کرتا۔ ایک رات میں واپس آیا تو وہ سو چکے تھے۔ بچے بلبلا رہے تھے مگر میں والدین کے پاس کھڑا رہا اور انھیں جگانا بھی ناپسند سمجھا حتی کہ صبح ہوگئی۔ اے اللہ! اگر میں نے یہ تیری رضا کے لیے کیا ہے تو اس پتھر کو دور کردے۔ اس دعا سے اتنا پتھر دور ہوگیا کہ آسمان نظر آنے لگا۔ اب دوسرے شخص نے دعا کی: اے اللہ میں اپنی چچا زاد بہن سے شدید محبت کرتا تھا۔ میں نے اسے 100 دینار پر راضی کرلیا۔ میں دینار لایا تو وہ کہنے لگی: اللہ سے ڈر جا اور ''مہر'' کو ناحق نہ کھول۔ تو میں وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اے اللہ! اگر میں نے یہ تیرے لیے کیا ہے تو ہمارا راستہ کھول دے، لہٰذا راستہ مزید کھل گیا۔ پھر تیسرے شخص نے دعا کی، اے اللہ! میں نے ایک شخص سے کام لیا۔ اسے مزدوری دینی تھی مگر اس نے کم سمجھتے ہوئے مزدوری نہ لی۔ میں نے اس اجرت کی رقم سے گائیں خریدیں وہ بڑھتی گئیں حتی کہ ایک نگران بھی رکھ لیا۔ وہ مزدور پھر کبھی آیا تو میں نے یہ سب کچھ اس کے سپرد کردیا۔ اے اللہ! اگر تیری رضا کے لیے تھا تو راستہ کھول دے۔ لہٰذا تمام راستہ کھل گیا۔[1]

اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ نیک لوگوں کے واقعات کے ساتھ ساتھ ان کی کرامات بھی بیان کی جاسکتی ہیں۔ ہاں! ان کا حقیقت پر مبنی ہونا اور واقعۃً اولیاء سے

[1] دیکھیے: صحيح البخاري، حديث: 5974.

صادر ہونا ضروری ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے سامنے اسی نوعیت کا ایک واقعہ بھی بیان ہوا جس سے ہمیں اولیاء کی کرامات بیان کرنے کا جواز ملتا ہے۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شخص کہیں سے اپنے اہل وعیال کے پاس آیا اور جب اس نے ان کی غربت دیکھی تو جنگل کی طرف نکل گیا۔ اس کی بیوی نے جب یہ دیکھا تو وہ چکی کی طرف گئی اور اسے (تیار کرکے) رکھ دیا، نیز تندور بھڑکایا، پھر دعا کی: اے اللہ! ہمیں رزق عطا فرما، پھر اس نے دیکھا کہ اچانک چکی کا ٹب بھر گیا ہے۔ وہ تندور کی طرف گئی تو اسے بھی (بکری کی بھنی ہوئی رانوں سے) بھرا پایا۔ خاوند واپس آیا اور اس نے پوچھا: کیا میرے جانے کے بعد تمھیں کچھ میسر آیا؟ وہ بولی: ہاں ہمارے رب کی طرف سے رزق ملا ہے، پھر وہ چکی کی طرف گیا (اور اس کا پاٹ اٹھا لیا) نبی اکرم ﷺ سے اس کا ذکر کیا گیا تو آپ نے فرمایا:

((أَمَا إِنَّهُ لَوْ لَمْ يَرْفَعْهَا لَمْ تَزَلْ تَدُورُ إِلَى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ)).

''ہاں! اگر وہ اسے نہ اٹھاتا تو تا قیامت وہ چکی گھومتی رہتی۔'' [1]

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے اولیاء کی پہچان کرنے، ان سے محبت کرنے اور ان کا ادب و احترام کرنے کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین

أُحِبُّ الصَّالِحِينَ وَلَسْتُ مِنْهُمْ
لَعَلَّ اللّٰهَ يَرْزُقُنِي صَلَاحًا

''میں نیک لوگوں سے محبت کرتا ہوں، اگرچہ میں ان میں سے نہیں ہوں۔
اُمید ہے اللہ تعالیٰ مجھے اس کی توفیق دے دے گا۔''

[1] مسند أحمد: 2/513، و السلسلة الصحيحة، حديث: 2937.

باب : 11

علمائے کرام کا ادب واحترام

علم کے شناور، دین کے داعی، عمل کے راہی، خلوص کے پیکر، خوفِ الٰہی سے سرشار، اطاعت گزار، استقامت کے پہاڑ، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت میں گرفتار اور دنیا سے بے نیاز رہنے والے ہی حقیقی معنوں میں علمائے ربانی کہلانے کے حقدار ہیں۔مگر کئی لوگ علماء کے روپ میں علمائے ربانی کی بدنامی کا باعث بنتے ہیں۔ ان کے اہداف بھی کچھ اور ہوتے ہیں اور طرز عمل بھی مختلف ہوتا ہے۔

اگر معاشرے میں ایک ڈاکٹر کا احترام اس وجہ سے ہے کہ وہ ایک خیر خواہ کے طور پر لوگوں کی جسمانی بیماریوں کی تشخیص کر کے ان کا علاج کرتا ہے تو دین کا داعی جو عقائد سے متعلقہ اور معاشرے میں پھیلی ہوئی بیسیوں خرابیوں کی نشاندہی کر کے ان کی اصلاح کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس کا احترام کیوں نہیں؟ اگر ایک لیکچرار، پروفیسر اور استاذ کا ادب واحترام اس لیے ہے کہ وہ علوم وفنون سے آشنا کرتے ہیں تو اس معلم کا ادب واحترام کیوں نہیں جو لوگوں کو علوم عالیہ سے بہرہ ور کرتا ہے، حالانکہ دونوں نے تقریباً ایک جیسا وقت لگا کر تعلیمی مراحل طے کیے ہوتے ہیں۔اگر چاند پر جانے کے خواب سنا کر لوگ احترام کے قابل بن جاتے ہیں تو چاند سے اوپر، ستاروں سے بھی اوپر آسمانوں سے بھی اوپر عرش الٰہی کے نیچے جنت الفردوس کی حقیقت کی طرف دعوت دینے والے کیوں ناقابلِ احترام ٹھہرے ہیں!!

اس کے دو ہی اسباب ہو سکتے ہیں یا تو لوگوں کو مذہب سے کوئی دلچسپی اور دین کی ضرورت نہیں اور معاشرتی برائیوں کا خاتمہ اور عقائد کی اصلاح ان کے ہاں کوئی معنی نہیں رکھتے یا پھر داعیانِ کرام اور علمائے عظام نے اپنا وقار کھو لیا ہے۔ عمومی طور پر یہ دونوں اسباب ہی کارفرما ہیں ...... علماء نے بھی اپنا رخ بدلا اور ان کی ترجیحات بھی بدل گئیں اور بالآخر ؂

بدلی زمانے کی ہوا، ایسا تغیر آ گیا
تھے جو گراں قیمت کبھی، اب ہیں متاعِ کس مخر

یہی وجہ ہے کہ اس دور میں پچھلے ادوار کے نامور علمائے کرام ایسے علماء نظر نہیں آتے۔ بہر حال ایسے علماء کا وجود بھی امت پر اللہ کا ایک انعام ہے۔

قرآن و حدیث کے علم کا حصول اور اس کی اشاعت فرضِ کفایہ ہے، علمائے کرام ہی امت کی طرف سے یہ فرض ادا کر رہے ہیں۔ جدید تہذیب نے میڈیا سے لیس ہو کر محاذ کھولا تو ان کے مقابلے میں تہذیب نبوی کے محاذ پر یہی علمائے کرام ہی نبرد آزما موجود رہے۔ جو معاشرہ اور سماج انھیں قبول نہیں کرتا اس کے سامنے بھی دعوت دین پیش کرتے ہیں۔ آسمانی ہدایت کی تھوڑی بہت روشنی، دھیمی سی آواز اور معمولی سی تحریک جو نظر آ رہی ہے یہ علمائے کرام ہی کی رہینِ منت ہے۔

ایک خاص طبقہ یہ سمجھتا ہے کہ علماء کی محض یہ ذمہ داری ہے کہ یہ بچے کے کان میں اذان دیں اور نکاح اور جنازے پڑھائیں اور بس۔ اسی پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر بعض وارثان منبر و محراب بھی یہ خیال کر بیٹھتے ہیں اور یہ کہتے سنائی دیتے ہیں کہ ہم نہ ہوں گے تو تمھارے نکاح اور جنازے کون پڑھائے گا۔ ان ذمہ داریوں کے علاوہ ایک عالم معاشرے کا عضو معطل نظر آتا ہے، حالانکہ اصل ذمہ داری تو یہ ہے کہ علمائے

کرام معاشرے کو صحیح دین سے روشناس کرائیں اور قرآن وحدیث کی تعلیم سے لے کر تربیت تک اور علم سے لے کر عمل تک تمام مراحل طے کریں اور کرائیں۔ اور ان تعلیمات کا معاشرے پر انطباق کریں۔

الغرض! معاشرے کو دین کی اہمیت اور ضرورت کا اندازہ ہونا چاہیے اور علمائے کرام کو اپنی عظمت رفتہ اور کھوئے ہوئے وقار کا۔

علماء پر اعتراضات اور ان کا جائزہ

عمومی طور پر علمائے کرام پر یہ اعتراضات کیے جاتے ہیں:

- قول وفعل میں تضاد۔
- شدت پسندی یا کم ظرفی۔
- ایک دوسرے کا بطلان اور تردید۔
- علم میں عدم رسوخ، خصوصاً مسائل حاضرہ سے ناآشنائی۔
- زہد وورع کا فقدان۔
- دینی خدمات کا معاوضہ لینا۔

جہاں تک قول وفعل میں تضاد کا تعلق ہے تو ان کے علاوہ لوگوں میں یہ تضاد اس سے بھی زیادہ ہے، مثلاً ہر کلمہ گو اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا زبان سے اقرار کرتا ہے مگر اکثریت کا یہ عالم ہے کہ ان کی کتاب زندگی کے کسی حاشیے پر بھی اس اقرار کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ وہ زبان سے اپنے آپ کو مومن یا مسلمان کہتا ہے مگر عملی طور پر اس کا کلی مخالف ہے۔ یہ قول وفعل میں کھلم کھلا تضاد ہے۔ اس کے باوجود علماء کے قول وفعل میں تضاد نہیں ہونا چاہیے تاکہ ان کی بات میں

اثر ہو۔ معاشرے میں ان کا نمایاں مقام ہوتا ہے۔ اسے پہچاننا چاہیے۔

شدت پسندی یا کم ظرفی کی وجہ تو یہ ہے کہ ایک نقطۂ نظر جو پہلے دن سے کسی کو ذہن نشین کرایا گیا ہو، اسی نقطۂ نظر سے اسے تعلیم دلوائی گئی ہو تو اس میں شدت آ جانا ایک فطری تقاضا ہے۔ مثال کے طور پر پاکستان کی ایک سیاسی پارٹی نے وزیر اعظم کے خلاف شروع دن سے یہ نظریہ اپنا لیا کہ یہ غلط ہے اس کے ہر کام میں کیڑے نکالنے شروع کر دیے۔ یہی پیغام اپنے ورکروں کے ذہنوں میں بھرا گیا تو اب اس سیاسی جماعت کا ہر چھوٹا بڑا مرد و عورت وزیر اعظم کے خلاف ایسا متشددانہ رویہ رکھتے ہیں گویا پاکستان کا سب سے بڑا دشمن یہی ہے۔ یہی حال ہمارے دینی نظام تعلیم کا ہے۔ اس میں اپنے موقف کو سو فیصد درست اور دوسرے کے موقف کو سو فیصد غلط قرار دینے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ایسے میں ان کے رویوں میں تشدد ایک لازمی نتیجہ ہے۔ مگر اس رویے میں فرق آنا چاہیے۔ لیکن ہم اپنے مجموعی طرز عمل کو دیکھیں کیا علماء کیا سیاستدان، کیا قائدین اور کیا عوام سبھی شدت پسندی کا شکار ہیں۔ اس کا اندازہ آپ کو اس وقت ہو گا جب آپ کسی مجمع عام میں کوئی ایسی بات کریں جو دوسروں کے موقف سے مختلف ہو۔

علماء اس صورتِ حال کا زیادہ نشانہ اس لیے بنتے ہیں کہ انھوں نے مجمع عام میں اپنے موقف کا اظہار کرنا ہوتا ہے۔ عام لوگ پتہ نہیں کتنے کتنے سخت موقف لیے پھرتے ہیں!!

کم ظرفی کی ایک وجہ یہ ہے کہ معاشرے نے علماء کو نہ تو صحیح معنوں میں قبول کیا اور نہ ہی علماء نے معاشرے میں گھل مل جانے کی کوشش کی۔ طرز تکلم سے لے کر لباس و پوشاک تک ہر چیز میں معاشرے سے ایک فاصلہ رکھا۔ اس سے تنگ نظری کی فضا نے جنم لیا۔ عموماً حقوق سے محروم لوگوں کو ایسی صورت حال سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔

مگر کیا ہی اچھا ہو کہ علماء کے اندر ایسی کوئی خامی نہ ہو جو ان کے مقام میں کمی کا باعث بنے اور ان کی بات کا وزن نہ رہے۔

نبی ﷺ کے ساتھ بھی بعض اوقات انتہائی نامناسب رویہ اختیار کیا جاتا مگر آپ ایسی صورت حال کو بڑی کشادہ ظرفی سے ٹال دیتے۔

مدارس کے نظام تعلیم میں بہتری لانے سے علمائے کرام کی علمی صلاحیتوں میں گرانقدر اضافہ ہوسکتا ہے۔ مگر جانچ پڑتال کا نظام اور نصاب ایسا نہیں کہ علم میں رسوخ ہو سکے۔ اتنا ضرور ہے کہ اب مدارس میں بہتری آرہی ہے اور اچھے اہل علم سامنے آنے لگے ہیں۔ [1] ہم جو کہتے ہیں کہ پہلے دور میں فلاں عالم کا بڑا چرچا تھا وہ بہت جلسوں پر جاتے تھے، ان کے پاس لوگوں کا تانتا بندھا رہتا تھا، اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ علماء ہوتے ہی بہت کم تھے۔ اکثر بستیوں اور دیہاتوں میں کوئی عالم نہیں ہوتا تھا۔ لوگ جمعہ یا تو نہیں پڑھتے تھے یا انھیں کسی شہر کا رخ کرنا پڑتا تھا۔ اب تقریباً ہر بستی اور گاؤں میں اچھے علماء مل جاتے ہیں۔ اور کتب و رسائل نے بھی علماء کا کام خاصا آسان کر دیا ہے اور کمپیوٹر نے تو بہت ہی آسانی پیدا کر دی ہے۔

اسی طرح زہد و ورع کا حال ہے۔ جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اس کا جائزہ لیں تو یہ بات نظر آئے گی کہ علمائے کرام جیسے بھی ہیں بہرحال عمومی تاثر میں عام لوگوں سے زہد و ورع میں پھر بھی اچھے ہیں۔ اور بعض علماء تو بہت ہی زاہد اور متقی ہیں۔ اس میں علم کا قصور نہیں بلکہ آدمی کی اپنی خوش نصیبی اور بد نصیبی کا کردار ہے۔

جہاں تک دینی خدمات پر معاوضے کا تعلق ہے تو یہ ایک جائز امر ہے۔ بہت سے

[1] اس حوالے سے مسلم پبلی کیشنز نے ایک کتاب شائع کی ہے: ''اچھا عالم بننے کے لیے'' وہ قابل مطالعہ ہے۔

ائمہ کرام ؒ اس کے جواز کا فتوی دیتے ہیں۔مگر راقم کا ہمیشہ یہی موقف رہا ہے کہ علماء کو ساتھ ساتھ اپنا کوئی بھی مناسب کام کرتے رہنا چاہیے۔تاکہ یہ کسی کے دست نگر نہ ہوں۔ اوردین کا کام بڑی خوش اسلوبی سے کریں۔لیکن اگر علماء کل وقتی خدمات انجام دے رہے ہیں اوراس بارے میں وہ کچھ طے بھی کرتے ہیں تو یہ لوگوں کی نگاہ میں تو جرم ہوسکتا ہے مگر شریعت میں اس کا جواز واضح طور پر موجود ہے۔ جیسا کہ سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے بچھوڈسے ایک شخص کو تیس بکریوں کی شرط پر سورۂ فاتحہ کا دم کیا تھا۔ یہ معاملہ جب آپ ﷺ کے ہاں پیش ہوا تو آپ نے فرمایا:

((قَدْ أَصَبْتُمْ، اِقْسِمُوا وَاضْرِبُوا لِي مَعَكُمْ سَهْمًا)).

”یقیناً تم نے درست کیا ہے۔تم آپس میں بکریاں تقسیم کرلواور ہاں ! اپنے ساتھ ساتھ میرا حصہ بھی نکالنا۔“[1]

سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے تو محض ایک دم کرنے کی اتنی اجرت لی تو اگر کوئی شخص شب و روز آپ کے بچوں کو تعلیم دے، اذانیں دے، نمازیں پڑھائے اور ایک منٹ بھی آگے پیچھے نہ ہونے دے تو وہ اجرت کیوں نہیں لے سکتا!!! اگر اس روزی میں شک ہوتا تو نبی ﷺ کبھی بھی اپنا حصہ نکالنے کا حکم نہ دیتے اور نہ ہی انھیں آپس میں تقسیم کرنے کی تلقین فرماتے۔

دوسری طرف دیکھا جائے تو ایک ڈاکٹر تھرمامیٹر ہلا کر مریض کے منہ میں رکھتا ہے اور ٹارچ یا لائٹ سے اس کے گلے کو دیکھتا ہے اورنسخہ لکھ کر 1500 روپے لے لیتا ہے کوئی اس سے تو نہیں کہتا کہ کس چیز کا معاوضہ لے رہا ہے۔

[1] صحيح البخاري، الإجارة، باب مايعطى في الرقية، حديث:2276، 5007.

دیکھا جائے تو معاوضے میں فرق بھی بہت ہے۔ مدارس و مساجد میں مقرر ائمہ، علماء اور اساتذہ کی عمومی طور پر تنخواہیں ہمارے ہاں مزدوروں کی رائج ماہانہ آمدن سے کم ہیں۔ اور اس پر بھی علماء کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اور ان پر یہ ایک باقاعدہ اعتراض ہوتا ہے۔

یہ تو تھے علماء پر کیے جانے والے بعض اعتراضات اور ان کا مختصر جائزہ۔
یہ دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا کہ ہر عالم کلی طور پر ان اعتراضات سے مبرا ہے مگر ہر عالم کو ان اعتراضات کا شکار بھی نہیں کہا جا سکتا۔ اگرچہ ان کا کچھ تناسب پایا جانا کوئی بعید نہیں۔ ہم جس عہد سے گزر رہے ہیں نیکی کا رجحان نہ ہونے کے برابر ہے، شرم و حیا کا فقدان ہے، اقدار و روایات چھینی جا رہی ہیں، ہر شخص دنیا کی دوڑ میں لگا ہوا ہے اور انسانیت بہت سی معاشرتی برائیوں سے اٹی ہوئی ہے تو علماء کا بھی ایسی آلودہ فضا کا شکار ہو جانا کوئی بعید نہیں۔ 21 ویں صدی میں رہتے ہوئے علماء بھی تو 21 ویں صدی کے میسر آ سکتے ہیں۔ یہ تو ناممکن ہے کہ 21 ویں صدی گزارنے والے لوگوں کو علماء ساتویں، آٹھویں یا نویں صدی عیسوی کے میسر آئیں۔ ظاہر بات ہے کہ دودھ میں جو اثرات ہوتے ہیں ان اثرات کا کریم یا مکھن میں پایا جانا ایک یقینی امر ہے۔ معاشرے سے چنیدہ لوگوں کی حالت بھی ویسی ہی ہوگی جو معاشرے کی ہے۔

علمائے کرام کا ادب و احترام کیوں؟

جو شخص اس عارضی زندگی کے بارے میں ہم سے ہمدردی کرتا ہے تو اسے ہم خیر خواہ سمجھتے ہیں اور اسے ادب و احترام بھی دیتے ہیں اس لیے جو شخص ہمیشہ کی زندگی کی بہتری اور کامیابی کی بات کرتا ہے وہ ہمارے ادب و احترام اور محبت و مقام کے

زیادہ لائق ہے۔ آپ ﷺ نے اس بارے میں بڑے نمایاں الفاظ میں فرمایا ہے:

((لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ يُجِلَّ كَبِيرَنَا وَيَرْحَمْ صَغِيرَنَا وَيَعْرِفْ لِعَالِمِنَا حَقَّهُ)).

''وہ ہم مسلمانوں کے طریقے پر نہیں جو ہمارے بڑے کی قدر نہیں کرتا، ہمارے چھوٹوں سے شفقت نہیں کرتا اور ہمارے علماء کا حق نہیں پہچانتا۔''[1]

علماء کی قدر ومنزلت

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اپنی الوہیت کی گواہی دی اور اس گواہی کے ساتھ فرشتوں اور اربابِ علم کو شامل فرمایا ہے، چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ﴾

''اللہ تعالیٰ نے گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتوں اور اہل علم نے بھی گواہی دی اس حال میں کہ وہ قائم ہے انصاف کے ساتھ۔''[2]

اس سے علمائے ربانی کی قدر ومنزلت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اہل علم کے بارے میں کئی ارشادات فرما کر ان کے مقام ومرتبے کو واضح کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ ان کا مقام عام لوگوں جیسا نہیں بلکہ بلند ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾

---

[1] صحیح الجامع الصغیر: 5443۔ [2] آل عمران 3:18.

''اے پیغمبر! فرما دیجیے: جو علم والے ہیں اور جو علم نہیں رکھتے کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟'' [1]

اس آیت مبارکہ میں پوچھے گئے سوال کے تین ممکنہ جواب ہو سکتے ہیں:

1 اہل علم اور بے علم برابر ہیں۔

2 اہل علم بے علم لوگوں سے برابر نہیں بلکہ بلند ہیں۔

3 اہل علم بے علم لوگوں سے کم تر ہیں۔

درست جواب پوچھا جائے تو سب یہی کہیں گے کہ جواب نمبر 2 درست ہے مگر اکثر لوگ اپنے سلوک اور طرز عمل سے جواب نمبر 3 کا اظہار کرتے ہیں۔

مذکورہ آیت میں علماء کے مقام کو بلند کیا گیا ہے۔ اور حسب ذیل آیت میں بھی ان کے مقام کو رفعت سے نوازا گیا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ﴾

''تم میں سے جو ایمان لائے انھیں اور جنھیں علم دیا گیا اللہ تعالیٰ انھیں درجات میں بلندی سے نوازتا ہے۔'' [2]

اس کا مطلب یہ ہے کہ علماء کا مقام و مرتبہ عام لوگوں سے زیادہ ہے۔

علماء کی خصوصیت یعنی خشیت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾

[1] الزمر 9:39۔ [2] المجادلة 11:58.

”سوائے اس کے نہیں اللہ تعالیٰ سے اس کے بندوں میں سے علماء ہی ڈرتے ہیں۔“ [1]

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ)).

”علماء انبیائے کرام علیہم السلام کے وارث ہیں۔“ [2]

علماء کے حقوق میں ایک بنیادی حق ان کے ادب و احترام کا ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ کا فرمان ہے:

((إِنَّ مِنْ إِجْلَالِ اللّٰهِ إِكْرَامَ ذِي الشَّيْبَةِ الْمُسْلِمِ وَحَامِلِ الْقُرْآنِ)).

”یقیناً اللہ کی تعظیم میں سے یہ بات بھی ہے کہ سفید بالوں والے بزرگوں کا اور حاملین قرآن کا اکرام و احترام کیا جائے۔“ [3]

حاملین قرآن سے مراد اسے یاد رکھنے والے، اسے اپنانے والے اور اس پر عمل کرنے والے ہیں۔ ان کا احترام دراصل اللہ کا اکرام ہے۔ یہ بہت بڑی تلقین نبوی ہے۔

انبیائے کرام علیہم السلام کے وارث بننا کوئی معمولی اعزاز نہیں ہے۔ علماء کو اس کی لاج رکھنی چاہیے اور عوام کو بھی انھیں یہ مقام دینا چاہیے۔

ایک اور مقام پر بھی نبی ﷺ نے علماء کا ذکر انبیائے کرام علیہم السلام کے ساتھ کیا ہے، فرمایا: ”سخت ترین آزمائش انبیائے کرام کی ہوتی ہے۔“ صحابی نے دریافت کیا: ان کے بعد کس کی؟ فرمایا: ”پھر علماء کی۔“ اس نے سوال کیا: ان کے بعد؟ فرمایا: ”نیک

[1] فاطر 28:35۔ [2] سنن أبي داود، حديث:3641۔ [3] سنن أبي داود، حديث:4843.

لوگوں کی۔"[1]

اسی طرح فرمایا: "اللہ تعالیٰ جس سے بھلائی کا ارادہ کرتا ہے اسے دین کی سمجھ بوجھ عطا کرتا ہے۔"[2]

یعنی علماء وہ لوگ ہیں جن کے ساتھ اللہ نے بھلائی کا ارادہ کیا ہے۔

یہ بھی ارشادِ نبوی ہے: "جو شخص کسی راستے میں حصولِ علم کی خاطر چلا ہو تو اللہ تعالیٰ اسے جنت کی راہوں میں سے ایک راہ پر چلائے گا۔ اور بلاشبہ فرشتے طالب علم کی رضا مندی کے لیے اپنے پر بچھاتے ہیں۔ اور صاحب علم کے لیے آسمانوں میں بسنے والے، زمین میں رہنے والے حتیٰ کہ پانی کے اندر پائی جانے والی مچھلیاں بھی مغفرت طلب کرتی ہیں۔ اور بلاشبہ عالم کی عابد پر فضیلت ایسے ہی ہے جیسے کہ چودھویں کے چاند کی سب ستاروں پر۔"[3]

وہ شخص جس کے لیے مذکورہ تمام چیزیں دعائے مغفرت کرتی ہیں یقیناً اس کا یہ حق ہے کہ اس کے لیے آپ بھی دعائیں کریں اور اس کا ادب واحترام بھی کریں۔

نصیحت اور لوگوں کی اقسام

نصیحت کے حوالے سے لوگوں کی دو اقسام ہیں:

ایک تو وہ جو نصیحت قبول کر لیتے ہیں اور نصیحت کرنے والے کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ دوسرے وہ ہیں جو نصیحت قبول نہیں کرتے۔ الٹا ناصح کو جائز اور ناجائز تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ اللہ کے برگزیدہ پیغمبر علیہم السلام اپنے اپنے امتیوں سے کہہ رہے

[1] صحيح الترغيب، حديث:3403۔ [2] صحيح البخاري، حديث:3116۔ [3] سنن أبي داود، حديث:3641.

ہیں کہ میں تمھیں نصیحت کرنے والا ہوں جبکہ قوم نے نصیحت قبول کرنے کے بجائے مختلف اعتراضات کر دیے کہ نعوذ باللہ آپ میں شعور کی کمی ہے، آپ پر ایمان لانے والے گھٹیا قسم کے لوگ ہیں، یہ کیسے رسول ہیں جو کھاتے بھی ہیں اور بازاروں میں چلتے پھرتے بھی ہیں، رسول کے ساتھ کوئی فرشتہ ہونا چاہیے تھا یا کوئی خزانہ یا باغ ہونا چاہیے تھا اور اسی قسم کے دوسرے اعتراضات اور مطالبے سامنے رکھے۔ ان کے یہ مطالبے سو فیصد غلط تھے مگر ان کی آڑ میں وہ نصیحت کرنے والے پیغمبروں کو جھٹلاتے رہے۔

دراصل نصیحت کو ٹھکرانے والے لوگ اپنے آپ کو آزاد خیال کرتے ہیں اور وہ کسی بھی قسم کی نصیحت کو اپنی خود ساختہ آزادی پر حملہ تصور کرتے ہیں۔ آج بھی یہی حال ہے کہ علمائے کرام قرآن وحدیث کی روشنی میں نصیحت پیش کرتے ہیں اور نصیحت قبول کرنے والے ان علمائے کرام کو عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور دوسرا طبقہ انھیں یہ مقام دینے پر قطعاً تیار نہیں۔ یہ دوسرا طبقہ بس یہی نہیں کہ خود نصیحت قبول نہ کرے بلکہ نصیحت کرنے والوں کو بدنام اور بے عزت کرنا اپنے فرائض میں سے سمجھتا ہے۔ اور باقاعدہ مہم چلائی جاتی ہے۔ بہت کم لوگوں کو پتہ ہوگا کہ جب پاکستان میں 1964ء میں پاکستان ٹیلی وژن کا آغاز ہونا تھا تب اس کے مقاصد میں سے ایک اہم اور باضابطہ مقصد یہ بیان کیا گیا تھا کہ لوگوں کے ذہنوں میں بیٹھے ہوئے ''مولوی'' کو نکالنا ہے۔ کیونکہ ''مولوی'' نکلے گا تو تہذیب حاضر کی چکا چوند سے وہ لوگوں کو متاثر کر پائیں گے۔

خیر القرون میں علماء کا مقام و مرتبہ

ہم ذرا اپنی تاریخ کی طرف پلٹتے ہیں۔ عہد نبوی میں 70 قرائے کرام رضی اللہ عنہم کو

شہید کیا گیا تو نبی کریم ﷺ مہینہ بھر اس جرم میں ملوث قبائل کے خلاف قنوت کرتے رہے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے آپ ﷺ کو کسی اور پر اس قدر شدید غصے میں نہیں دیکھا۔[1]

رسول اللہ ﷺ نے منصب امامت علماء اور قراء کے سپرد کر کے انھیں ایک اعزاز بخشا۔ شہدائے احد کو دفن کرنے کی باری آئی تو آپ ﷺ نے دو دو شہداء کو ایک ایک کفن پہنایا پھر فرمایا:

((أَيُّهُمْ أَكْثَرُ أَخْذًا لِلْقُرْآنِ)).

''ان میں سے قرآن مجید کسے زیادہ یاد تھا؟''

تو جب ان میں سے کسی ایک کی طرف اشارہ کیا جاتا تو اسے لحد میں آگے کرتے۔[2]

عمومی طور پر اگرچہ یہ ایک معمولی سا فرق ہے مگر رسالت مآب ﷺ کی طرف سے اس نازک موقع پر استفسار کہ قرآن کسے زیادہ یاد ہے پھر اسے لحد میں آگے کرنا علماء اور قراء کے ساتھ خصوصی اعزاز کا پتہ دیتا ہے۔ دراصل آپ ﷺ اس بات کی تعلیم دے رہے تھے کہ علمائے کرام اور قرائے کرام کی قدر و منزلت کا خیال رکھنا چاہیے۔ جب شہادت کے بعد آپ علیہ السلام زیادہ قرآن یاد کرنے والے کو دوسرے کی نسبت زیادہ اعزاز دے رہے ہیں تو زندگی میں بالاولی اس بات کا خیال رکھنے کا حکم ہو گا۔ جی ہاں! بالکل ایسا ہی تھا۔

وفد ثقیف اسلام لایا تو نبی ﷺ نے عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ کو ان پر امیر مقرر کیا، حالانکہ یہ ان سب میں سے عمر میں چھوٹے تھے۔ یہ اس وجہ سے تھا کہ وہ دین

[1] صحيح البخاري، حديث:1001 و 1300۔ [2] صحيح البخاري، حديث:4079.

میں سمجھ بوجھ اور قرآن مجید سیکھنے پر ان سب سے زیادہ حریص تھے۔[1]

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں نافع بن عبدالحارث کو مکہ کا گورنر بنایا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں عسفان میں دیکھا تو پوچھنے لگے: وادی مکہ پر کسے عامل مقرر کیا ہے؟

نافع: ابن ابزیٰ کو۔

عمر رضی اللہ عنہ: ابن ابزیٰ کون ہے؟

نافع: ہمارے آزاد کردہ غلاموں میں سے ایک ہیں۔

عمر رضی اللہ عنہ: تم نے اہل مکہ پر ایک آزاد کردہ غلام کو عامل بنا دیا ہے؟

نافع: وہ کتاب اللہ کو پڑھنے والا اور علم فرائض سے آشنا ہے۔

عمر رضی اللہ عنہ: اگر یہ بات ہے تو (سن لو!) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

((إِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتٰبِ أَقْوَامًا وَّيَضَعُ بِهِ آخَرِينَ)).

"اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعے قوموں کو عروج دیتا اور دوسروں کو رسوا کرتا ہے۔"[2]

اسی کا ترجمہ اقبال نے یوں پیش کیا ہے ؎

وہ معزز تھے زمانے میں مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

قرآنِ مجید پڑھنے، پڑھانے اور سمجھنے سمجھانے میں علمائے کرام کا کردار کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ آج اگر مختلف پروفیسر یا کرنل حضرات نے قرآن فہمی اور ترجمے کا کام

[1] الإصابة، ترجمة عثمان بن أبي العاص۔ [2] صحيح مسلم، حديث: 817۔

کیا ہے تو اس کی بنیاد بھی علمائے کرام ہی ہیں۔ کسی بھی دینی کام اور دینی تحریک حتی کہ کسی دینی سرگرمی کو دیکھ لیں اس کی بنیادوں میں کسی اچھے عالم کا کردار بول رہا ہو گا!!

الغرض! عہد نبوی اور خلافت راشدہ اور بعد کے ادوار میں علمائے کرام کا بہت ادب و احترام تھا۔ علماء کی جوتیاں سیدھی کرنے کو بڑے بڑے لوگ ایک اعزاز سمجھتے تھے۔

ظاہری بات ہے دودھ سے بھرے برتن کو جب تک اونچا کر کے یا جس میں دودھ انڈیلنا ہے اس خالی برتن کو نیچا کر کے اس میں دودھ نہیں انڈیلا جائے گا تب تک دوسرا برتن خالی ہی رہے گا۔

نبی کریم ﷺ کی یہ پیش گوئی زمانہ آخر میں علم اور اہل علم کی ناقدری کی عکاسی کرتی ہے:

((مِنْ أَشْرَاطِ السَّاعَةِ أَنْ يَقِلَّ الْعِلْمُ وَيَظْهَرَ الْجَهْلُ)).

"قیامت کی علامات میں سے ہے کہ علم کم ہو جائے گا اور ہر طرف جہالت نظر آئے گی۔"[1]

دوسری حدیث میں ہے:

((إِنَّ اللّٰهَ لَا يَقْبِضُ الْعِلْمَ اِنْتِزَاعًا يَنْتَزِعُهُ مِنَ النَّاسِ وَلٰكِنْ يَقْبِضُ الْعِلْمَ بِقَبْضِ الْعُلَمَاءِ)).

"یقیناً اللہ تعالیٰ علم کو لوگوں (کے سینوں) سے نہیں کھینچ لیتا لیکن علم علماء کے ساتھ اٹھ جاتا ہے۔"[2]

اس صورت حال کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عمومی طور پر معاشرے میں علمائے کرام کا

---

(1) صحيح البخاري، حديث:81۔ (2) صحيح مسلم، حديث:2673.

ادب و احترام اور عزت و وقار نہیں۔ ان کی اولاد معاشرے میں جو دیکھتی ہے اس بنا پر وہ کسی صورت اس کٹھن راہ کو اختیار کرنے کی متحمل نہیں ہوتی۔ اور اچھے بھلے دین سے محبت کرنے والے اپنے نونہالوں کو کانٹوں کی اس سیج پر چلانا نہیں چاہتے۔

علمائے کرام کے ادب و احترام کی صورتیں

- علمائے کرام کو عزت، وقار اور احترام دیا جائے۔
- علمائے کرام کو فوقیت دی جائے۔
- علمائے کرام کو معاشرے کا ایک حصہ سمجھ کر ان کو اپنی تقاریب میں شریک کیا جائے نہ کہ محض نکاح پڑھانے یا دعا کرانے وغیرہ کی مجبوری کے باعث۔
- ان کی ضروریات کا خیال رکھا جائے۔ پہلے ادوار میں یہ نظام بیت المال یا اوقاف کے ذمے ہوتا تھا۔
- ''مولوی'' اور ''صوفی'' کے لفظ ہمارے مسلم معاشرے میں حقارت آمیز لہجے میں کسی بھی ایسے شخص کے لیے بولے جاتے ہیں جس نے داڑھی رکھی ہو بلکہ جس نے شیو نہ کرائی ہو اسے بھی انھی لفظوں سے یاد کیا جاتا ہے اور ایک اچھے بھلے عالمِ دین جنھوں نے دینی تعلیم کے حصول و تدریس میں عمر گزاری ہو انھیں بھی انھی الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے۔

معاشرہ انھیں کس ''جرم'' کی سزا دے رہا ہے؟ یہ کسی کو بھی پتا نہیں۔ اس وجہ سے علمائے کرام کے لیے مناسب الفاظ استعمال کرنے چاہئیں۔ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ دوسرے مسلمان کو حقیر سمجھے۔

- امیر کبیر لوگ اپنی اولادوں کو دینی علوم سے وابستہ کریں۔ اس سے علمائے کرام کی

تکریم ہوگی اور انھیں حوصلہ ملے گا۔

ــ غیبت تو کسی بھی مسلمان کی نہیں کرنی چاہیے مگر علمائے کرام کی غیبت سے بالاولی بچنا چاہیے کیونکہ ان کی غیبت سے نقصان ان کی دعوت کو پہنچے گا۔ اور ان کی بات میں وزن نہیں رہے گا۔ اسی لیے کہا جاتا ہے:

((لُحُومُ الْعُلَمَاءِ مَسْمُومَةٌ)).

''علماء کی غیبت کر کے ان کا گوشت کھانا بہت زہریلا ثابت ہوتا ہے۔''

ــ اب تو لوگ پہلے گزرے ہوئے علماء کو یاد کرتے ہیں اور کہتے ہیں وہ صحیح عالم تھے مگر ان کے دور کے لوگ انھیں بھی ایسے ہی ستاتے تھے۔ اس کا بے لاگ تجزیہ اور سروے ان کے تذکروں سے کیا جا سکتا ہے۔ راقم کو اپنی چار نسلوں کی تاریخ سے اس کا بخوبی اندازہ ہے۔ ممکن ہے بعد والے لوگ موجودہ دور کے علماء کو غنیمت سمجھیں۔ آپ سے تو انھی معاملات کے متعلق پوچھا جانا ہے جن سے آپ گزر رہے ہیں۔

ــ علمائے کرام سے نفرت اور عداوت کی بنیاد پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو اس کی تہہ میں کوئی بات نظر نہیں آئے گی۔ اس وجہ سے ان سے عداوت ختم کی جائے۔

ــ علمائے کرام سے کسی مسئلے کی دلیل اچھے انداز سے طلب کرنا ان کی بے ادبی کے زمرے میں نہیں آتا۔ اور نہ علماء کو اسے اپنی توہین سمجھنا چاہیے۔

ــ آپ ایک لمحے کے لیے سوچیں! آپ ایک ایسے معاشرے میں رہتے ہوں جہاں آپ کو کوئی عالم نظر آئے نہ آپ کسی سے مسئلہ پوچھ سکیں۔ آپ کی کوئی دینی راہ نمائی کرے نہ کوئی قرآن مجید پڑھانے والا نظر آئے۔ کوئی نماز پڑھانے والا مل سکے نہ جنازے پڑھانے والا۔ کوئی مسئلہ درپیش ہو تو اس کا حل نہ مل پائے اور کوئی بھی شخص

آپ کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے فرامین اور احکام نہ سنائے، تو آپ اس معاشرے میں کیسے زندگی گزاریں گے۔ دیارِ غیر میں رہنے والے ان مسلمانوں سے پوچھیے جو اس بڑی سہولت سے محروم ہیں۔ اس وجہ سے علمائے کرام کو غنیمت سمجھیے اور ان سے اللہ واسطے کا بیر ختم کیجیے!

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے عہد کے اور گزرے ہوئے علمائے کرام کی عزت اور قدر کرنے کی اوران کا ادب واحترام کرنے کی توفیق سے نوازے۔ آمین

باب : 12

والدین کا ادب واحترام

برطانیہ کا رہائشی ایک لڑکا اپنی والدہ کا بڑا نافرمان اور بے ادب تھا۔ وہاں کے بچوں کی عمومی نوعیت ایسی ہی ہے۔ اللہ کا کرنا کہ لڑکا دولت اسلام سے آراستہ ہوا تو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اس کا اپنی والدہ سے برتاؤ بتدریج بہتر ہونے لگا۔ نتیجتاً اس کی والدہ بھی دین اسلام میں دلچسپی لینے لگی کہ اس کی تعلیمات نے میرے بچے کے میرے ساتھ رویے کو بہتر بنا دیا ہے۔ بالآخر ایک دن وہ بھی اسلامی برادری میں شامل ہوگئی۔

ہمارے ایک نومسلم بھائی عبدالوارث کا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ ان کے والدین نے ابھی اسلام قبول تو نہیں کیا مگر اسلام کے بہت قریب آگئے ہیں ...... اللہ انھیں بھی توفیق دے۔ اسلام سے بڑھ کر اور کوئی مذہب والدین کے ادب واحترام کی تعلیم نہیں دیتا۔

والدین کا مقام واحترام

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے کئی مقامات پر اپنی عبادت کے بعد والدین کے ساتھ احسان کا ذکر فرمایا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾

''اور آپ کے رب نے فیصلہ دیا ہے کہ صرف اسی کی عبادت کرو اور والدین

کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔"[1]

اور احسان یا حسن سلوک میں پہلا درجہ ادب و احترام کا آتا ہے۔ اسی لیے حسنِ سلوک کے مذکورہ قرآنی حکم کے فوراً بعد ادب و احترام کے پہلو کو بڑے احسن انداز میں بیان فرمایا ہے۔ اگر کوئی شخص والدین کی بہت خدمت کرتا ہو، ان کی ضروریات کا خیال رکھتا ہو مگر ان کے ادب و احترام کا خیال نہ رکھے تو یہ خدمت بھی کام نہیں آتی۔ کیونکہ کام تو ہو ہی جاتے ہیں نوکر چاکر بھی کر دیتے ہیں مگر اولاد کی طرف سے والدین کے احترام سے والدین پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ تو کسی اور صورت میں نہیں مل پاتے۔ مساج کرنے والی کرسیاں بھی مل جاتی ہیں مگر کئی بچوں کے والدین جب اپنے بوڑھے والدین کے ادب و احترام میں ان کے پاؤں دباتے ہیں یہ کرسیاں، یہ پلنگ اور بلند کوٹھیاں اس کے مقابلے میں ہیچ نظر آتی ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے بعد والدین کے ساتھ احسان کا حکم فرمایا اور ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا:

﴿إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِندَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُل لَّهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُل لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا ○ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُل رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا﴾

"اگر تیرے سامنے ان میں سے ایک یا دونوں ہی بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو انھیں اف تک بھی نہ کہنا اور نہ انھیں جھڑک اور ان سے نرم (لہجے میں) بات کر اور ان دونوں کے لیے نیاز مندی سے عاجزی کا بازو جھکائے رکھ اور کہہ: اے میرے رب! ان دونوں پر رحم فرما جس طرح ان دونوں نے بچپن میں

[1] بنيٓ إسرآءيل 23:17.

میری پرورش کی۔"[1]

یہ آیت مبارکہ والدین کے ازحد ادب و احترام پر بہت واضح راہ نمائی کرتی ہے۔ یہ شعور بیدار کرتی ہے کہ بچپن میں تیری پرورش کرنے والے والدین ہی تھے۔ جنھوں نے اپنا آپ بھلا کر اپنا آپ گنوا کر تیری پرورش کی۔ اب تو ان کے اس احسان کو یاد رکھ اور شفقت و نیاز مندی کا پہلو ان کے لیے جھکائے رکھ، انھیں اف تک نہ کہہ اور نہ انھیں جھڑک بلکہ ان کے لیے رب کے حضور دعائیں کرتا رہ۔

والدین کے ادب و احترام کی صورتیں

ہماری لغت میں بڑوں کے سامنے ''کیوں'' کا لفظ بھی گستاخی شمار ہوتا ہے۔ لفظ ''کیوں'' کے کئی درجے بنائے جائیں تو سب سے آخر میں ''اف'' کا لفظ آتا ہے۔ والدین کے لیے یہ بھی استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ جو یہ کہنے سے رک گیا وہ والدین کی نافرمانی اور ان کے حق میں دیگر جرائم سے بالاولیٰ باز آجائے گا۔

صحیح بخاری میں موجود تین غار والوں کا قصہ زبان زد عام ہے اسے مختصراً پیچھے ذکر کیا گیا ہے مگر اب موضوع کی مناسبت سے کہ وہ تینوں بارش سے بچ کر غار میں گئے اور غار کے دہانے پر ایک چٹان آ کے ٹک گئی۔ اب تینوں نے اپنے ان اعمال کا واسطہ دینے کا فیصلہ کیا جو انھوں نے اللہ کی رضا کے لیے کیے تھے۔ ان میں سے ایک شخص نے کہا: اے اللہ! میرے والدین انتہائی عمر رسیدہ تھے اور میرے چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ میں بکریاں چرایا کرتا تھا۔ جب میں بکریاں چرا کر شام کو آتا میں دودھ دوہتا تو اپنے بچوں سے پہلے والدین سے آغاز کرتا اور انھیں دودھ پلاتا۔ ایک دفعہ یوں ہوا کہ

[1] بنيٓ إسرآءيل 23:17.

بکریاں چرانے کے لیے مجھے دور جانا پڑا اور خاصی شام ہو گئی۔ میں گھر پہنچا تو وہ دونوں سو چکے تھے۔ میں نے روٹین کے مطابق دودھ دوہا اور دودھ لے کر ان کے سرہانے کھڑا ہو گیا۔ اور انھیں بیدار کرنا بھی گوارا نہ کیا اور ان سے پہلے اپنے بچوں کو دودھ پلانا بھی ناپسند سمجھا، جبکہ بچے میرے قدموں کے پاس بلبلا رہے تھے۔ پوری رات اسی حالت میں گزر گئی اور فجر ہو گئی۔ اے اللہ! اگر تو جانتا ہے کہ میرا یہ عمل تیری رضا کی خاطر تھا تو کشادگی فرما دے تاکہ ہم آسمان تو دیکھ سکیں تو اللہ تعالیٰ نے اس چٹان کو کچھ ہٹایا اور انھیں آسمان نظر آنے لگا۔[1]

آگے بڑھنے سے قبل ہم اس حدیث پر امام بخاری رحمہ اللہ کی تبویب پر نظر ڈالتے ہیں۔ وہ یہ ہے:

بَابُ إِجَابَةِ دُعَاءِ مَنْ بَرَّ وَالِدَيْهِ.

''جو شخص اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کرتا ہے اس کی دعا کی قبولیت کے بارے میں باب۔''

اس موقف کو سیدنا اویس قرنی رحمہ اللہ کے متعلق اس فرمان نبوی سے بھی تائید حاصل ہوتی ہے:

((يَأْتِي عَلَيْكُمْ أُوَيْسُ بْنُ عَامِرٍ مَعَ أَمْدَادِ أَهْلِ الْيَمَنِ . . .)).

''تمھارے پاس اویس بن عامر قرنی اہل یمن کے ساتھ غازیوں کے قافلے میں آئیں گے۔ ان پر درہم کے برابر برص کا ایک نشان باقی ہو گا۔ وہ اپنی والدہ سے نیکی اور احسان کرتے ہوں گے۔ اگر وہ اللہ پر قسم بھی ڈال دیں تو

[1] صحيح البخاري، حديث:5974.

اللہ اسے پورا کر دے گا۔ تو (اے عمر رضی اللہ عنہ!) اگر تم سے ہو سکے کہ وہ تمھارے لیے بخشش کی دعا کریں تو ایسا ضرور کرنا۔"[1] چنانچہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی زندگی میں اپنی اس آرزو کو پورا کیا۔

ماں کے ساتھ احسان کے بدلے میں اللہ تعالیٰ نے سیدنا اویس قرنی رحمہ اللہ کو کتنے اعزازات سے نوازا۔ ان میں سے ایک دعا کی قبولیت بھی ہے۔

جب ہم تین غار والوں میں سے پہلے شخص کی نیکی کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ وہ بچوں پر والدین کو ترجیح دیتا تھا۔ یقیناً جو شخص اپنے والدین کو ترجیح دیتا ہے، اس کے بچے یہ سبق سیکھ کر اس کو بھی ترجیح دیتے ہیں۔

ایک بچہ ڈرائنگ بنا رہا تھا۔ اس نے گھر بنایا اور مین دروازے کے پاس ایک کمرہ سا بھی بنایا۔ بچے کے والد نے پوچھا یہ تو گھر ہے مگر یہ کمرہ کیسا ہے؟ وہ بچہ بولا: ابو جان! یہ آپ کا کمرہ ہے۔

والد: یہ اس طرح عام سا اور سب سے علیحدہ کیوں؟

بچہ: آپ نے بھی تو ہمارے دادا جان کو ایسے ہی رکھا ہوا ہے۔ جب آپ بوڑھے ہوں گے تو ہم بھی آپ کو یہاں رکھیں گے۔ اللہ ایسے سلوک سے ہر ایک کو محفوظ رکھے۔ آمین

غار والے تین افراد کی حدیث پر بات چل رہی تھی۔ اس شخص کے ہاں والدین کے ادب و احترام کی انتہا یہ ہے کہ رات بھر وہ والدین کے سرہانے کھڑا رہا مگر انھیں بیدار نہ کیا اور بچے بلبلاتے چھوڑ دیے۔ ایسے بچے والدین سے کتنی دعائیں لیتے ہیں۔ اور یہی دعائیں سرمایہ حیات بن جاتی ہیں۔

[1] صحیح مسلم، حدیث: 2542.

اس حدیث سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ والدین کو ترجیح دینے اور ان کا ادب و احترام کرنے سے بلائیں اور آفات بھی ٹلتی ہیں جیسا کہ ان غار والوں سے ایک بڑی مشکل ٹل گئی مگر یہ سب کچھ اس صورت میں ہے جب مقصود اللہ کی رضا ہو۔ اگر ایک انسان محض والدین ہونے کے ناطے سے صلہ رحمی یا احسان کرتا ہے اور اس میں رب کی رضا شامل نہیں کرتا تو جیسے اس نے اپنی کاوشوں سے اللہ تعالیٰ کو نکال دیا اسی طرح وہ بھی ان انعامات الٰہی سے محروم ہو جاتا ہے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر تو اس غار والے شخص نے آخر میں یہ کہا تھا: اے اللہ! اگر تو جانتا ہے کہ میں نے یہ کام تیری چاہت کی خاطر کیا ہے تو ہمارے لیے کشادگی فرما دے۔

دراصل ہمارے جس بھی فطری تعلق میں اللہ کی رضا شامل ہو گی تو اس تعلق کے نتائج بھی عمدہ برآمد ہوں گے۔ اور جو تعلق، صلہ یا احسان اللہ کی رضا کے لیے ہو گا تو لازماً اس تعلق اور رشتہ داری کو نبھانے کے لیے اللہ کی اطاعت اختیار کرنے کا جذبہ پیدا ہو گا اور ایسا شخص اللہ کی نافرمانی سے احتراز کرے گا۔

الغرض! انسان والدین کی خوشنودی کے ذریعے سے اللہ کی رضا کا متلاشی نظر آئے، کیونکہ یہ نسبی تعلق جوڑنے والی ذات اللہ کی ہے۔ ہمارے نسب اللہ ہی نے بنائے ہیں۔ اسی اصول کو رحمت دو عالم ﷺ نے یوں بیان فرمایا:

((رِضَا الرَّبِّ فِي رِضَا الْوَالِدَيْنِ وَسُخْطُهُ فِي سُخْطِهِمَا)).

”رب کی رضا والدین کی رضا میں اور رب تعالیٰ کی ناراضگی والدین کی ناراضگی میں ہے۔“ [1]

اصل مقصود اللہ کی رضا ہونی چاہیے، حقیقی منزل وہی ہے۔

[1] الجامع الصغیر: 582/2، حدیث: 5820.

والدین کے حقوق کی تو لمبی فہرست ہے مگر ہم یہاں ان کے ادب و احترام کے حوالے سے بحث کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سیدنا یوسف علیہ السلام کے تذکرے میں خصوصی طور پر فرمایا ہے:

﴿وَرَفَعَ اَبَوَيۡهِ عَلَى الۡعَرۡشِ﴾

''اور یوسف علیہ السلام نے اپنے والدین کو اپنے تخت پر اونچا بٹھایا۔''[1]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ والدین کو ادب و احترام اور خصوصی مقام دینا چاہیے۔ والدین کا ادب و احترام اور ان کے مقام کو پہچاننا انبیائے کرام علیہم السلام اور صالحین کا شیوہ ہے۔ اس میں ان ''متقی لوگوں'' کے لیے بڑا سبق ہے جن کے ماتھے ان کی عبادت کی گواہی دیتے ہیں مگر والدین کے ادب و احترام کے حوالے سے وہ بہت پیچھے ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے اپنے والد سے مکالمے کا تذکرہ کیا ہے۔ اسے سورہ مریم آیات 42-48 میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اس میں ابراہیم علیہ السلام کا اپنے والد سے طرزِ تکلم ادب کی چاشنی اور محبت و الفت لیے ہوئے ہے۔ ادب کی یہ چاشنی ﴿يَا أَبَتِ﴾ کی بار بار تکرار سے چھلک رہی ہے۔ جس کے معنی ہیں میرے پیارے ابا جان! سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے والد انھیں رجم کرنے کی دھمکی دیتے ہیں مگر ابراہیم علیہ السلام اس کا جواب بھی انھی الفاظ میں دیتے ہیں:

﴿سَلَامٌ عَلَيۡكَ سَاَسۡتَغۡفِرُ لَكَ رَبِّيۡ﴾

''سلام ہو! عنقریب میں اپنے رب سے آپ کی بخشش کی دعا کروں گا۔''

اللہ تعالیٰ نے دعا کرنے سے تو روک دیا مگر ابراہیم علیہ السلام کا اپنے والد سے اچھے

1 یوسف 100:12.

انداز تکلم سے تو نہیں روکا۔ کہاں اس وقت کی دنیا کا سب سے بڑا توحید کا علمبردار اور کہاں بڑا بت گر ...... اور کہاں مکالمے کا یہ انداز!! یہ سب کچھ ہمیں سکھا رہا ہے کہ موقف چاہے ٹھوس ہو سخت ہو مگر لہجہ ادب و احترام اور پیار و محبت سے بھرا ہوا ہو۔

سیدنا اسماعیل علیہ السلام اپنے والد سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا از حد احترام کرتے ہیں۔ والد کی کامل اطاعت کا یہ جذبہ اللہ کو اچھا لگا تبھی تو اللہ نے قرآن مجید کا حصہ بنا دیا:

﴿يَآ أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللّٰهُ مِنَ الصَّابِرِينَ﴾

"اے میرے ابا جان! آپ کو جو حکم ہوا ہے آپ کر گزریں آپ مجھے ان شاء اللہ صابر ہی پائیں گے۔"[1]

بھاگنے دوڑنے کی عمر اور لڑکپن کا عالم اور ایسے عمدہ جذبات!! سچ کہا تھا اقبال نے:

یہ فیضان نظر تھا یا مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیلؑ کو آدابِ فرزندی

نبی کریم ﷺ نے اپنی رضاعی والدہ محترمہ کے لیے اپنی چادر بچھا کر دراصل امت کو سبق دیا کہ وہ اپنے والدین کا ادب و احترام کریں۔

فتح مکہ کے موقع پر سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے والد گرامی کو اٹھا کر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں لائے اور انھیں آپ ﷺ کے سامنے بٹھا دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَوْ أَقْرَرْتَ الشَّيْخَ فِي بَيْتِهِ لَأَتَيْنَاهُ)).

"کاش! آپ اپنے والد بزرگوار کو ان کے گھر ہی میں رہنے دیتے کہ ہم ان

[1] الصّٰفّٰت 37:102.

کے پاس آجاتے۔‘‘

آپ ﷺ نے یہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی عزت افزائی کے لیے کہا تھا، اس موقع پر ابوقحافہ رضی اللہ عنہ اسلام لے آئے۔[1]

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا خود اپنے والد گرامی کو اٹھا کر لانا ان کی تکریم پر دلالت کرتا ہے اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اس عمل پر نبی کریم ﷺ جہاں ابوبکر رضی اللہ عنہ کی عزت افزائی کے متمنی تھے، وہاں بوڑھے والدین کی سہولیات کا خیال رکھنے کی طرف بھی اشارہ فرما رہے تھے۔ دوسروں سے بھی یہ کام لیا جاسکتا تھا مگر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ انھیں خود اٹھا کر لائے تھے۔ مگر آپ ﷺ نے عمر رسیدہ بزرگ کا اس قدر اکرام کیا کہ آپ ﷺ نے فرمایا انھیں گھر ہی رہنے دیا ہوتا ہم خود ان کے پاس چلے جاتے۔ درس نبوی سے مسلمانوں کو سبق مل رہا ہے کہ بوڑھے والدین کی ضروریات اور کمزوریوں کا خیال رکھیں۔ کسی ہو جانے والے کام کی بابت اچھے جذبات کے اظہار سے وہ کام دوبارہ تو نہیں ہو جاتا مگر آئندہ کے لیے اچھی راہ نمائی بھی مل جاتی ہے۔ اور جذبات پہنچ جاتے ہیں۔

انھی اسلامی تعلیمات کا اثر تھا کہ امام محمد بن سیرین رحمہ اللہ جیسے جلیل القدر تابعی اپنی والدہ محترمہ کے ادب واحترام کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ایک دفعہ محمد بن سیرین اپنی والدہ محترمہ کی خدمت میں حاضر تھے۔ ایک آدمی ان سے ملاقات کے لیے آیا۔ وہ آدمی محمد بن سیرین رحمہ اللہ کی مجلس پہلے دیکھ چکا تھا اور ان کے رعب اور علمی جاہ وجلال سے واقف تھا۔ جب اس نے محمد بن سیرین رحمہ اللہ کو ایک خاتون کے سامنے اس طرح تواضع اور خاکساری کے عالم میں دیکھا تو وہاں موجود لوگوں سے پوچھنے لگا کہ کیا یہ محمد بن سیرین ہی ہیں؟ کیا یہ بیمار ہو گئے ہیں؟ یہ اس قدر سہمے ہوئے کیوں نظر آرہے

[1] مسند أحمد:3/160.

ہیں، پھر اسے یہ جان کر تعجب ہوا کہ وہ اپنی ماں کی خدمت میں اسی انداز سے رہا کرتے ہیں۔ امام محمد بن سیرین رحمہ اللہ کے بارے میں یہ بھی آتا ہے کہ وہ اپنی والدہ صاحبہ سے بات کرتے تو شرم محسوس کرتے ہوئے اپنی پوری زبان سے بات نہیں کرتے تھے۔[1]

امام محمد بن سیرین رحمہ اللہ کا یہ طرز عمل اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی عکاسی کرتا ہے:

"اور ان دونوں کے لیے اپنا عاجزی کا پہلو نیاز مندی سے جھکائے رکھ۔"

اس واقعے کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ والدین کا ادب و احترام کرنے سے علم تعبیر میں سے حصہ ملتا ہے کیونکہ امام محمد بن سیرین رحمہ اللہ اس بارے میں امام کہلاتے ہیں۔

عمر بن ذر رحمہ اللہ سے کسی نے پوچھا: آپ کے صاحبزادے کا آپ سے سلوک کیسا ہے؟ کہنے لگے: دن کو نکلتا ہوں تو وہ (میرے احترام میں) میرے پیچھے پیچھے رہتا ہے، رات کو (میری حفاظت کے لیے) آگے آگے چلتا ہے، جب گھر میں ہوتا ہوں تو وہ کبھی چھت پر نہیں چڑھتا (کیونکہ وہ اسے بے ادبی تصور کرتا ہے۔)[2]

ہمارے اسلامی معاشرے میں ان روایات کی کچھ نہ کچھ جھلک بہر حال کسی نہ کسی صورت میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ الحمد للہ علی ذالک۔

اولاد کو اپنے والدین کی نیک نامی، اچھی شہرت اور عزت و توقیر کا باعث بننا چاہیے۔ یہ بھی ان کے ادب و احترام میں شامل ہے۔ جب اولاد اپنے والدین کی عزت اور وقار کا خیال رکھے گی تو دوسرے لوگ بھی ان کے والدین کی عزت کریں گے۔ نبی کریم ﷺ نے اپنے والدین کی عزت کا دفاع کرنے کا ایک سنہرا اصول بتایا

---

[1] والدین کی اطاعت و نافرمانی واقعات کی زبانی، ص:271، بحوالہ تاریخ دمشق:162/56، وسیر أعلام النبلاء:618/4۔ [2] "والدین"، ص:131 بحوالہ سعادۃ الدارین:77-78.

ہے وہ یہ ہے کہ انسان دوسروں کے والدین کی عزت کی پاسداری کرے۔ ان کے لیے کوئی نازیبا الفاظ استعمال نہ کرے۔ سیدنا عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إِنَّ مِنْ أَكْبَرِ الْكَبَائِرِ أَنْ يَّلْعَنَ الرَّجُلُ وَالِدَيْهِ)).

''یقیناً کسی شخص کا اپنے والدین کو لعن طعن کرنا انتہائی کبیرہ گناہوں میں سے ایک ہے۔''

عرض کی گئی: اے اللہ کے رسول! کیسے کوئی شخص اپنے والدین کو لعن طعن کر سکتا ہے؟ فرمایا: ''ایک آدمی دوسرے آدمی کے والد کو گالی دیتا ہے جس کے نتیجے میں گالی دینے والے کے باپ کو برا بھلا کہا جاتا ہے اور وہ اس کی ماں کو برا بھلا کہتا ہے تو وہ اس کی ماں کو برا بھلا کہتا ہے۔''[1]

یہ حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلیٰ ماہر نفسیات ہونے پر دلالت کرتی ہے کہ کسی کے والدین کو برا بھلا کہنے کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس کے اپنے والدین کو برا بھلا کہا جاتا ہے کیونکہ انسان اپنے والدین کے متعلق کچھ سننا گوارہ نہیں کرتا۔

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ پڑھتے ہیں۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں گھوڑا پیش کیا گیا تو ایک انصاری نے اس کا مطالبہ کر دیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انکار کیا کیونکہ وہ اچھے بھلے کھاتے پیتے تھے۔ اس نے آپ رضی اللہ عنہ کو برا بھلا اور بخیل کہنا شروع کر دیا اور ناراضی کا اظہار بھی کیا۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کہنے لگے: میں اس پر کسی ایسے بچے کو سوار کر دوں جس کے ابھی ختنے بھی نہ ہوئے ہوں یہ مجھے اس سے زیادہ اچھا لگتا ہے کہ میں تمھیں اس پر سوار کروں۔ یہ سن کر انصاری بولا: میں آپ سے اور آپ

[1] صحيح البخاري، حديث:5973.

کے والد سے زیادہ گھڑسواری جانتا ہوں۔ یہ دیکھ کر مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے۔ اس کے سر سے پکڑا اور ناک پر گھونسا دے مارا ...... بعدازاں انصاری کے لواحقین قصاص لینے آئے تو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ کی قسم! قوم اپنے گھروں سے نکل جائے یہ ان کے لیے زیادہ آسان ہے کہ میں ان لوگوں سے بدلہ لوں جو اللہ کے بندوں کو شر سے روکتے ہیں۔[1]

سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے اس وقت انتقامی کارروائی کی جب اس انصاری نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے والد محترم کے بارے میں نازیبا انداز اختیار کیا۔

اسی طرح حدیث مذکور میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سوال سے ثابت ہوتا ہے کہ قدیم جاہلیت میں یہ خوبی بہرحال موجود تھی کہ وہ اپنے والدین کی عزت کا دفاع کیا کرتے تھے۔ اس لیے تو انھوں نے حیرانی سے دریافت کیا کہ ایک شخص اپنے والدین کو کیسے گالی نکال سکتا ہے۔ مگر جدید جاہلیت میں ایسی مثالیں بھی ہیں کہ اپنے والدین کو برا بھلا کہنے کا سبب بننا تو معمولی بات سمجھی جاتی ہے ستم بالائے ستم یہ کہ یہ خود ہی اپنے والدین کو برا بھلا کہتے ہیں۔ بلکہ مار پیٹ اور گھر سے نکالنے تک پہنچ جاتے ہیں۔ والدین پر لکھی گئی کتابیں اس قسم کے واقعات سے بھری ہوئی ہیں۔ العیاذ باللہ۔

دلوں کی اس سختی کو شاعر کی زبانی یوں ہی بیان کیا جاسکتا ہے ؎

ہزاروں سال میں بس تاریخ اتنی ہی بدلی ہے جناب!

تب دور تھا پتھر کا، اب لوگ ہیں پتھر کے

جدید جاہلیت میں والدین کے ساتھ رویوں کی ایسی ایسی مثالیں ہیں کہ قدیم جاہلیت بھی منہ چھپاتی ہے۔ قدیم جاہلیت میں اپنی ماں کی عزت اور ان کے بارے

[1] المعجم الکبیر: 337/15، ومجمع الزوائد: 603/9۔

میں غیرت کا ایک یہ واقعہ بھی تاریخ میں موجود ہے کہ حیرہ کے ایک شاعر بادشاہ عمرو بن ہند نے اپنے دوستوں سے کہا کہ کوئی ایسا شخص ہے جس کی ماں میری ماں کی خدمت کرے اور اس پر وہ شخص خودداری کا مظاہرہ کرے۔ انھوں نے غریب شاعر عمرو بن کلثوم، جو سبعہ معلّقات کے شعراء میں سے ایک تھا، کا نام لیا۔ عمرو بن ہند نے عمرو بن کلثوم کو اپنی ملاقات اور اس کی والدہ لیلیٰ کو اپنی والدہ سے ملاقات کے لیے بلایا۔ اور شاہ حیرہ نے اپنی والدہ سے طے کیا کہ جب کھانا کھالیں تو لیلیٰ سے کہنا کہ آپ کی طرف جو پلیٹ ہے وہ مجھے پکڑا دیں۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ لیلیٰ نے جواب دیا: جسے کوئی ضرورت ہے وہ خود اٹھے۔ شاہِ حیرہ کی والدہ نے دوبارہ مطالبہ کیا اور اصرار کیا تو اس پر لیلیٰ نے زوردار آواز لگائی: ہائے! تغلب رسوا ہو گئے...... اس کے بیٹے عمرو بن کلثوم شاعر نے یہ آواز سنی تو غضبناک حالت میں اٹھا اور محل کی گیلری میں بادشاہ کی جو تلوار لٹک رہی تھی اسے لے کر بادشاہ کا سر قلم کر دیا۔ اور اس موقع پر شعر بھی کہے جو سبعہ معلّقات میں شامل ہیں۔

جو شخص اپنی ماں کے احترام میں کسی دوسرے کی طرف سے اتنی سی بات برداشت نہیں کر سکتا وہ خود کیسے ماں کی توہین یا بے ادبی کر سکتا ہے۔

جلیل القدر صحابی سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اپنے والد گرامی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا کس قدر احترام کرتے تھے؟ اس کا اندازہ آپ کو ذیل کے واقعے سے ہوگا۔ سیدنا عبداللہ بن دینار رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کو مکہ کے راستے میں ایک دیہاتی شخص ملا۔ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے انھیں سلام کہی اور جس گدھے پر سوار تھے وہ انھیں دے دیا اور اپنی پگڑی بھی اتار کر ان کے حوالے کر دی۔ ہم نے ان سے عرض کی: اللہ آپ کی اصلاح فرمائے! یہ تو دیہاتی لوگ ہیں جو تھوڑا بہت لے کر راضی ہو جاتے ہیں (اور آپ نے انھیں اتنا کچھ دے دیا؟) سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہنے لگے: ان کے والد محترم میرے والد

محترم عمر رضی اللہ عنہ کے پیارے دوست تھے اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے:

((إِنَّ أَبَرَّ الْبِرِّ صِلَةُ الْوَلَدِ أَهْلَ وُدِّ أَبِيهِ)).

''آدمی کی بہت بڑی نیکی ہے کہ اپنے والد کے دوستوں سے صلہ رحمی کرے.....''[1]

اس سے واضح ہوتا ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما محض عبادات ہی میں اتباع سنت کے جذبے سے سرشار نہیں تھے بلکہ معاملات میں بھی ان کا جذبہ قابل رشک تھا۔ اور یہ کہ صلہ رحمی محض زبان سے نہیں ہونی چاہیے۔ صلہ رحمی میں ''جیب'' بھی بڑا اہم کردار ادا کرتی ہے۔

اس حدیث کے ساتھ وہ صحیح حدیث بھی ملا لینی چاہیے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

((مَنْ أَحَبَّ أَنْ يَّصِلَ أَبَاهُ فِي قَبْرِهٖ فَلْيَصِلْ إِخْوَانَ أَبِيهِ مِنْ بَعْدِهٖ)).

''جسے پسند ہے کہ قبر میں موجود اپنے والد سے صلہ رحمی کرے تو اسے چاہیے کہ اپنے والد کے بعد اس کے بھائیوں سے صلہ رحمی کرے۔''[2]

محترم قارئین! اس تحریر کے دوران ہمارے والد محترم مولانا حکیم محمد ادریس فاروقی رحمہ اللہ، جو ماہ نامہ ضیائے حدیث لاہور کے بانی بھی ہیں، بہت یاد آرہے ہیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ ان کے لیے بخشش اور درجات کی بلندی کی دعا فرمائیں۔ ہم بھی دعا کرتے ہیں کہ جن لوگوں کے والدین یا دونوں میں سے ایک اللہ کے پاس پہنچ چکے ہیں اللہ ان کی بہتر مہمان نوازی فرمائے۔ اور انھیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور ہمیں ان کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔ اور ہماری اولادوں کو ہمارے بعد ہمارے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔ آمین!

[1] صحیح مسلم، حدیث: 2552۔ [2] السلسلة الصحيحة: 417/3، حدیث: 1432 .

باب: 13

اساتذۂ کرام کا ادب واحترام

استاد کی اہمیت

اساتذہ کرام، خواہ وہ دینی علوم سے آراستہ کرنے والے ہوں یا مختلف علوم و فنون سے آشنا کرنے والے ہوں، سبھی احترام کے لائق ہیں۔ دینی اورعصری علوم دونوں کی انسان کوضرورت رہتی ہے۔ اس لیے ان علوم وفنون سے آشنا کرنے والے اساتذہ کرام کا ادب کرنا چاہیے۔

اساتذہ کرام اپنے علم اور تجربے سے ایسے ایسے گرسکھا دیتے ہیں اور وہ کچھ پڑھا دیتے ہیں کہ اگر خود انسان وہ سفر طے کرنے لگے تو اس کی زندگی اسی میں بیت جائے۔ آج انسانیت جہاں کھڑی ہے وہ پہلے اساتذہ کی راہ نمائی اوران کے تجربات اورایجادات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہاں پہنچی ہے۔ اور یہ سب کچھ اللہ کے فضل و کرم ہی سے ممکن ہوا ہے۔ کیونکہ اس کا ارشاد ہے:

﴿وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ﴾

”اور وہ اس کے معمولی سے علم کا احاطہ بھی نہیں کر پاتے مگر جتنا وہ چاہتا ہے۔“[1]

1 البقرة 2:255.

اساتذۂ کرام کا ادب واحترام کیوں؟

استاد وہ ہستی ہے جو نونہالان قوم کو آسمان علم وفضل کی بلندیوں تک پہنچاتے ہیں۔ کیا آپ نے سوچا نہیں؟ آج آپ جو پڑھنے کے قابل ہوئے اور میں لکھنے کے قابل ہوا وہ اللہ کے فضل کے بعد اساتذہ کرام کی شفقتوں اور دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ اگرچہ کئی والدین اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت میں اساتذہ کرام سے بھی زیادہ محنت کرتے ہیں۔ ایسے والدین کا ایک روپ تو والدین کا ہوتا ہے اور دوسرا روپ استاد کا، گویا وہ اپنے بچوں کے والدین بھی ہوتے ہیں اور اساتذہ بھی۔

لوگوں کو بھلائی کی تعلیم دینے والے کی عظمت کے پیش نظر نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

((إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰئِكَتَهُ، وَأَهْلَ السَّمٰوَاتِ، وَالْأَرْضِ حَتَّى النَّمْلَةَ فِي جُحْرِهَا، وَحَتَّى الْحُوتَ لَيُصَلُّونَ عَلٰى مُعَلِّمِ النَّاسِ الْخَيْرَ))

"بے شک اللہ تعالیٰ رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے اور تمام آسمان والے اور زمین والے حتی کہ بلوں کے اندر چیونٹیاں لوگوں کو بھلائی کی باتیں سکھانے والے کے لیے رحمت کی دعائیں کرتی ہیں۔" [1]

نبی ﷺ نے یہاں "الخیر" کا بڑا جامع لفظ استعمال فرمایا ہے۔ جس میں سب سے پہلے دنیا وآخرت کی بھلائی، یعنی دین آتا ہے۔ جو لوگوں کو دین سکھاتا ہے وہ سب سے پہلے اس حدیث کا مصداق ہے۔ لیکن کیا رہن سہن کے گر، معاشرتی آداب اور زندگی کے مراحل طے کرنے کے لیے دیگر علوم وفنون سے متعارف کرانے والے اور دوسروں

[1] صحیح الترغیب: 1/19، حدیث: 81.

کو یہ سب کچھ سکھانے والے اس ''الخیر'' کے لفظ میں نہیں آتے؟ یقیناً وہ بھی اس جامع لفظ میں شامل ہیں۔ اگر محض دین ہی مراد ہوتا تو اس کے لیے ''الدین'' کا لفظ موجود تھا مگر ''الخیر'' فرما کر خیر کے تمام کاموں کو اس میں شامل کیا گیا ہے۔

ایسے لوگوں کا احترام ضروری ہے جن کے لیے اہل زمین و آسمان سب رحمت کی دعائیں کرتے ہیں اور اللہ ان پر رحمت اتارتا ہے۔

قرآن کریم اور اساتذہ کی عزت وتکریم

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں تخلیق آدم علیہ السلام کا واقعہ بیان کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تمام اشیاء کے نام سکھائے، پھر ان کو فرشتوں کے سامنے رکھا پھر فرمایا: مجھے ان کے نام بتاؤ اگر تم سچے ہو۔ فرشتے کہنے لگے کہ ہمارے پاس تو محض وہی علم ہے جو تو نے ہمیں سکھایا ہے، بے شک تو ہی جاننے والا اور حکمت والا ہے۔ اللہ نے آدم علیہ السلام سے فرمایا: آدم! انھیں ان کے نام بتاؤ، تو جب آدم علیہ السلام نے ان کے نام انھیں بتائے تو اللہ نے فرمایا: میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ بے شک میں ہی آسمانوں اور زمین کے پوشیدہ امور جانتا ہوں اور میں وہ بھی جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو، اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا آدم کو سجدہ کرو تو ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کیا۔[1]

قارئین کرام! آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم تب ملا جب انھوں نے فرشتوں کو ان چیزوں کے نام بتلائے۔ بس اس واقعے کی اسی ترتیب ہی سے میرا استدلال ہے۔ آدم علیہ السلام کو یہ اعزاز شرف آدمیت اور علم کی وجہ سے ملا اور اس وقت ملا جب انھوں نے فرشتوں کو نام پڑھائے اور بتائے۔ یہ واقعہ اساتذہ کرام کے احترام کی دلیل

[1] دیکھیے البقرۃ 2:31-34.

ہے۔اور اس سے یہ سمجھنا بھی مشکل نہیں کہ آدم علیہ السلام نے انہیں چیزوں کے نام سکھائے تھے۔علم کی یہ نوع دینی علوم کی بجائے سائنس سے تعلق رکھتی ہے۔اس وجہ سے لوگوں کو بھلائی اور خیر کی تعلیمات سے آشنا کرنے والوں کا بلاتفریق احترام ہونا چاہیے۔

قصۂ موسیٰ وخضر علیہما السلام میں اساتذہ کے ادب کے پہلو

سورۂ کہف میں سیدنا موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام کا واقعہ تفصیل سے بیان ہوا ہے۔اور سورۂ کہف ہر جمعے کو پڑھنے کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ترغیب دی ہے۔یوں سمجھ لیں کہ دیگر بہت سی تعلیمات کے ساتھ ہر جمعے کو اساتذہ کرام کے ادب کا ایک لیکچر آپ کو دیا جاتا ہے۔اگر دل کی آنکھیں کھلی ہوں۔قرآن مجید اپنے مخصوص پیرائے میں واقعات کے بیان میں بہت کچھ سمجھا دیتا ہے۔لہٰذا سیدنا موسی اور خضر علیہما السلام کے واقعے سے اساتذہ کے ادب واحترام اور مقام پر کچھ نکات پیش خدمت ہیں:

- سیدنا موسیٰ علیہ السلام اپنے سے بڑے عالم کی تلاش میں نکلے تھے، اس لیے اساتذہ کا ادب یہ ہے کہ ان کے پاس چل کر جایا جائے۔اس میں کوئی کلام نہیں کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا مقام ومرتبہ سیدنا خضر علیہ السلام سے زیادہ ہے کیونکہ موسیٰ علیہ السلام اولوالعزم پیغمبروں میں سے ہیں۔اور اس پر اور بھی کئی دلائل ہیں۔مگر وہ خود چل کر ان کی طرف جارہے ہیں۔
- سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے علم کی جستجو میں بہت مشقت برداشت کی حتی کہ فرمانے لگے:

﴿لَقَدْ لَقِينَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا﴾

''ہمیں اس سفر سے بڑی تھکاوٹ پہنچی ہے۔''

لہٰذا اساتذہ تک پہنچنے کے لیے مشقت برداشت کرنی پڑے تو اسے بھی قبول کرنا

چاہیے۔

- موسیٰ علیہ السلام نے اپنے شاگرد یوشع بن نون کو ساتھ لیا۔ ان کی ٹوکری میں مچھلی رکھی اور ان سے کہا: ”میں بس تم پر یہی ذمہ داری ڈالتا ہوں کہ جہاں مچھلی تم سے علیحدہ ہو جائے تو تم نے مجھے بتانا ہے۔“[1] یہ موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے اسائنمنٹ تھی، لہٰذا طلبہ یا سیکھنے والوں کو اپنے اساتذہ کی شرائط قبول کرنی چاہئیں اور ان کا پاس بھی رکھنا چاہیے۔

- علم کے میدان میں اسی وقت کامیابی حاصل ہوتی ہے جب اساتذہ اور طلبہ پر عزم ہوں اور دونوں تعلیم کے مشن میں سچے ہوں۔ اور ایک دوسرے کا ساتھ دیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: میں مجمع البحرین تک چلتا رہوں گا، خواہ مجھے مدتوں چلنا پڑے۔[2] استادِ محترم کے ان جذبات کا ان کے شاگرد نے مکمل خیال رکھا اور ساتھ ساتھ رہے۔ یہ بھی اساتذہ کا ایک ادب ہے کہ آپ ان کے ساتھ ساتھ رہیں۔ انھیں طلبہ و طالبات کا انتظار نہ کرنا پڑے بلکہ طلبہ ان کے انتظار میں ہوں۔ ہمارے ہاں صورت حال یہ ہوتی ہے کہ اساتذہ کرام اور پروفیسر حضرات وقت پر آ کر کلاس روم میں انتظار کر رہے ہوتے ہیں اور طلبہ و طالبات کیفے ٹیریا میں موج مستی میں مگن ہوتے ہیں۔

- سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے شاگرد مچھلی کے نکل جانے کی جگہ بتانا بھول گئے مگر سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے ان کی سرزنش نہ کی، لہٰذا طلبہ سے بھول چوک میں کچھ ایسا ہو جائے تو یہ اساتذہ کی بے ادبی اور نافرمانی میں نہیں آتا۔ اساتذہ کو اس پر سرزنش نہیں کرنی چاہیے۔

- یوشع بن نون علیہ السلام نے اپنی غلطی کو فوراً تسلیم کیا کہ

---

(1) صحيح البخاري، حديث:4726۔ (2) الكهف 18:60.

﴿فَاِنِّیْ نَسِیْتُ الْحُوْتَ وَمَآ اَنْسَانِیْهُ اِلَّا الشَّیْطٰنُ﴾

”میں مچھلی (کا سمندر میں چلے جانا) بھول گیا تھا اور یہ مجھے محض شیطان نے بھلایا۔“ [1]

اساتذہ کرام کے ادب میں سے ہے کہ پہلے تو اپنی ذمہ داری نبھانے کی کوشش کی جائے اور اسائنمنٹ پوری کی جائے مگر کسی عذر کی بنا پر ایسا نہ ہو سکے تو اپنی غلطی فوری طور پر تسلیم کر لی جائے۔ اس سے اکثر اساتذہ کی خلش دور ہو جاتی ہے۔ اور استاد و شاگرد کے رشتے میں کوئی دراڑ نہیں آتی۔

ـ سیدنا موسیٰ علیہ السلام جب خضر علیہ السلام سے ملے تو ان سے کہنے لگے:

﴿هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا﴾

”کیا میں آپ کے پیچھے چلوں اس بات پر کہ آپ کو جو بھلائی سکھائی گئی ہے اس میں سے مجھے بھی سکھائیں گے۔“ [2]

اس سے پتہ چلتا ہے کہ پروفیسرز اور اساتذہ کرام کا وقت لینے سے پہلے ان سے پوچھ لینا چاہیے۔ یہ ان کے آداب میں سے ہے۔ اگر وقت لیے بغیر یا اجازت لیے بغیر ان کے ساتھ شریک ہوں گے یا ان کے پیچھے پیچھے چلنا شروع کر دیں گے تو یہ بات ان پر گراں گزرے گی۔ انھیں ایسا محسوس ہوگا کہ وہ علم کسی نا اہل کے سپرد کر رہے ہیں۔ ان پر وہ تازگی اور فرحت نہیں ہوگی۔ اس لیے موسیٰ علیہ السلام نے ان سے پیچھے چلنے کی اجازت مانگی۔

یہ بھی اساتذہ کا ادب ہے طلبہ ان کے پیچھے چلیں۔

① الکھف 18:63۔ ② الکھف 18:66۔

- سیدنا خضر علیہ السلام نے کہا: ''آپ میرے ساتھ ہرگز صبر نہیں کرسکیں گے۔ اور آپ اس پر صبر بھی کیسے کر سکتے ہیں جس کا پوری طرح آپ نے علم ہی نہیں لیا۔'' اس پر موسیٰ علیہ السلام کہنے لگے: ''آپ مجھے ان شاء اللہ صبر کرنے والا پائیں گے اور میں آپ کے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کروں گا۔'' طلبہ کو چاہیے کہ وہ پابندیوں اور سختیوں کو خوش دلی سے قبول کریں۔ خواہ وہ کالج و یونیورسٹی اور مدارس و جامعات میں داخلے کی شرائط ہوں یا تعلیمی حوالے سے کچھ پابندیاں۔

یہ بھی اساتذہ کا ادب ہے کہ وہ طلبہ سے کسی اندیشے کا اظہار کریں تو طلبہ اپنے آپ کو بڑا ثابت کرتے ہوئے فخر و غرور کا رویہ اختیار نہ کریں بلکہ عجز سے جواب دیں جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام نے سیدنا خضر علیہ السلام کے اندیشے کا جواب بڑے اچھے انداز سے دیا۔

- جب پروفیسر حضرات یا اساتذہ کرام لیکچر دے رہے ہوں یا کچھ سمجھا رہے ہوں تو درمیان میں ٹوکنا اچھا نہیں۔ سیدنا خضر علیہ السلام نے اساتذہ کے ادب کا یہ پہلو بھی سمجھایا:

﴿فَلَا تَسْـَٔلْنِي عَنْ شَيْءٍ حَتّٰٓى أُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا﴾

''تو آپ مجھ سے اس وقت تک کوئی سوال نہ کرنا جب تک میں اس کا ذکر شروع نہ کروں۔''[1]

اگر کوئی سوال پیدا ہو تو بات کے اختتام پر پوچھا جاسکتا ہے۔ مگر علم کی پیاس کبھی کبھار ایسے آداب میں آڑے آجاتی ہے۔ مگر انجام کار اساتذہ سے مزید کسب فیض کا موقع میسر نہیں آتا جیسا کہ سیدنا خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کو دو دفعہ تو معاف کیا مگر تیسری دفعہ فرمانے لگے:

(1) الکہف 70:18.

﴿هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَ بَيْنِكَ﴾

''یہ میرے اور تمھارے درمیان جدائی (کا مرحلہ آ گیا) ہے۔''[1]

آیئے! اب دیکھتے ہیں کہ نبی ﷺ نے موسیٰ علیہ السلام کے بار بار سوال کرنے کو کس انداز سے لیا؟ آپ علیہ السلام نے فرمایا:

((وَدِدْنَا أَنَّ مُوسٰی كَانَ صَبَرَ حَتّٰی يَقُصَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا مِنْ خَبَرِهِمَا)).

''ہماری آرزو تھی کہ موسیٰ علیہ السلام صبر سے کام لیتے تاکہ اللہ تعالیٰ ہمارے سامنے ان کی مزید باتیں بھی بیان فرماتا۔''[2]

نبی کریم ﷺ کے یہ جذبات جہاں حصول علم کے شوق کا پتہ دیتے ہیں وہاں متلاشیان علم کو اساتذہ سے کسب فیض کے آداب سے بھی روشناس کراتے ہیں کہ جب وہ کچھ بتا رہے ہوں تو درمیان میں نہ ٹوکیں بلکہ ان کے بتانے کا انتظار کریں۔ شاید آپ کے ذہن میں اٹھنے والے سوال کا جواب آ رہا ہو۔

سیدنا جبریل علیہ السلام نبی ﷺ کی خدمت میں

نبی کریم ﷺ کے پاس جبریل امین علیہ السلام آئے۔ اس وقت وہ ایک انسان کے روپ میں تھے۔ انھوں نے آکر آپ ﷺ سے ایمان، اسلام اور احسان کی بابت سوالات کیے۔ گویا آپ ﷺ کو اللہ نے یہ اعزاز بھی دیا کہ آپ علیہ السلام جبریل امین کے استاد بھی بن گئے۔ میں یہاں جو بتانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اس وقت جبریل امین علیہ السلام نبی ﷺ کے سامنے دو زانو (جیسے ہم تشہد میں بیٹھتے ہیں) ہوکر بیٹھے تھے۔[3] جبکہ آپ ﷺ تو پہلے ہی اس حالت میں تشریف فرما تھے۔

① الکھف 78:18۔ ② صحیح البخاري، حدیث:4725۔ ③ صحیح مسلم، حدیث:8.

اساتذہ کرام کے احترام اوران کے سامنے بیٹھنے کا سلیقہ، صاف ستھرے سفید لباس میں ملبوس ہوکر، طہارت و نظافت کے ساتھ آنا جبریل امین علیہ السلام نے ہمیں سکھایا۔ ظاہر ہے اس میں آداب نبوت کا بھی پاس تھا۔ مگر ایک جھلک اساتذہ کے احترام کی بھی نکلتی ہے کیونکہ وہ ایک شاگرد کی صورت میں آئے تھے۔ مگر کیا کیا جائے بقول اقبال:

نہ سلیقہ تجھ میں کلیم کا، نہ قرینہ مجھ میں خلیل کا
تو ہلاک جادوئے سامری، میں قتیل شیوہ آزری

اساتذہ کرام کے احترام و مقام پر ایک عربی شاعر نے بڑے اچھے انداز سے نصیحت کی ہے۔

إِذَا أَفَادَكَ إِنْسَانٌ بِفَائِدَةٍ
مِنَ الْعُلُومِ فَأَدْمِنْ شُكْرَهُ أَبَدًا
وَقُلْ فُلَانٌ جَزَاهُ اللّٰهُ صَالِحَةً
أَفَادَنِيهَا وَأَلْقِ الْكِبَرَ وَالْحَسَدَا

"جب کوئی شخصیت تمھیں علمی فائدہ پہنچائے تو اس کے ہمیشہ شکر گزار رہو۔ اور دعا مانگو کہ اللہ فلاں شخصیت کو جزائے خیر دے کہ انھوں نے مجھے فائدہ پہنچایا ہے۔ اور فخر وحسد کو اپنے آپ سے بالکل نکال دو۔"

دراصل یہی احساس ہی اساتذہ کے ادب واحترام پر ابھارتا ہے۔

اساتذہ کرام کے ادب واحترام کی صورتیں

- اساتذہ کرام سے ادب سے بات کریں۔ آواز دھیمی اور لہجہ عمدہ ہو۔
- بعض اوقات کسی استاد کا کوئی تکیہ کلام یا انداز بن جاتا ہے۔ طلبہ و طالبات ان کی

نقل اتارنا شروع کردیتے ہیں۔ اور اپنی مجالس میں ان کی عیب جوئی کرتے اور ہنستے ہیں۔ یہ کسی صورت روانہیں۔

- اساتذہ کی سختی کو برداشت کریں۔ آج کل ''مارنہیں پیار'' کا جونعرہ لگایا جارہا ہے۔ یہ نعرہ بہت اچھا لگتا ہے مگر اس کے پیچھے چھپے آزادروی اور مادر پدر آزادی کے مکروہ چہرے کوبھی سامنے رکھیں۔ جیسے والدین انتہائی پیار اور شفقت کے باوجود بعض اوقات بچوں کو ڈانٹ لیتے ہیں اور مار پیٹ سے بھی کام لیتے ہیں، اسی طرح اساتذہ ضرورت محسوس کریں تو ان کی اس سرزنش کو برداشت کرنا چاہیے۔
- اساتذہ کرام کا نام ادب سے لیں۔ یہ ادب محض درخواست قبول کرانے کی غرض سے نہ ہو کہ ''مودبانہ گزارش ہے......'' بلکہ تمام تعلیمی مراحل میں اور اس کے بعد بھی ان کاادب واحترام ملحوظ رکھا جائے۔ یہ نہ ہو کہ بعد میں کبھی استاد صاحب نظر آئیں اور آپ راستہ ہی بدل لیں!!
- ان کی بات توجہ سے سنی جائے۔ اسے نوٹ کیا جائے۔ ان کی بات کو معمولی سمجھ کر نظرانداز نہ کیا جائے۔ توجہ دینے سے آپ خود استاد کی توجہ کا مرکز بن جائیں گے۔
- ان کے سامنے آپس کی باتوں سے پرہیز کیا جائے۔ نبی کریم ﷺ کے سامنے صحابہ کرام انتہائی خاموشی اور پوری توجہ سے بیٹھتے تھے۔ اگرچہ آداب نبوت بہت بلند ہیں مگر اس سے اساتذہ کرام کے ادب کی تھوڑی سی روشنی تو میسر آتی ہے۔
- استاد کے لیے دعائیں کریں۔ ان کی زندگی میں بھی اور اس دنیا سے رخصت ہونے کے بعد بھی۔
- یہ تصور نہ رکھیں کہ فلاں ڈکشنری یا شرح یا کتاب سے استفادہ کرکے اساتذہ ہمیں پڑھاتے ہیں میں وہی لے لوں گا اور بس! نہیں نہیں۔ اگر سب کچھ اساتذہ کی

محنت اور راہ نمائی کے بغیر کتابوں ہی سے حاصل ہو سکتا تو آج روئے زمین پر کوئی تعلیمی ادارہ نظر نہ آتا۔ انتہائی قابلیت اور لیاقت کے باوجود کئی ایک پہلو ایک طالب علم سے اوجھل رہ بھی سکتے ہیں۔ ویسے بھی جس کی کتاب سے آپ کچھ سیکھ رہے ہیں اسے بھی بالواسطہ اپنا استاد سمجھیں۔

- کبھی بھی اپنے آپ کو استاد سے مستغنی (بے نیاز) نہ سمجھیں۔
- اگر آپ طالب علم بن کر رہیں گے تو زندگی بھر بہت کچھ سیکھتے رہیں گے۔
- آج آپ اساتذہ سے اچھا سلوک کریں گے ممکن ہے کل کو استاد بننے کے بعد آپ سے بھی ایسا سلوک کیا جائے۔
- اساتذہ کرام کوئی کام کہیں یا کسی خواہش کا اظہار کریں تو اسے پورا کرنے کی حتی المقدور کوشش کریں۔
- اساتذہ کرام عمر میں چھوٹے ہی کیوں نہ ہوں پھر بھی ان کا احترام کریں۔
- اساتذہ کے ادب و احترام کے لیے یہ ضروری نہیں کہ دو چار سال یا اس سے زائد پڑھا ہو تو پھر ہی احترام کرنا ہے۔ آپ جہاں بھی پڑھتے ہوں وہاں کے تمام اساتذہ، خواہ ان کا پیریڈ آپ کے پاس نہ بھی ہو، وہ احترام کے لائق ہیں۔ بلکہ تمام اساتذہ کرام، خواہ وہ آپ کے متعلقہ ادارے سے نہ بھی ہوں اور آپ کے استاد نہ بھی ہوں پھر بھی احترام کے لائق ہیں کیونکہ وہ آپ ہی کے معاشرے کے لوگوں کو علم کا شناور بنا رہے ہیں۔ اگر علم ایک بڑی دولت ہے تو اس علم سے آشنا کرنے والے بھی بہت بڑی نعمت ہیں۔ اس لیے ان کی قدر کرنی چاہیے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اساتذۂ کرام کے ادب و احترام کی توفیق دے۔ آمین

باب: 14

بڑوں کا ادب و احترام

دین اسلام نے ادب و احترام کے دائرے کو بڑی وسعت دی ہے۔ یہ صرف اپنے سے متعلقہ لوگوں کے درجہ بدرجہ احترام کی تعلیم نہیں دیتا۔ بلکہ اپنے سے بڑوں کا احترام بھی سکھاتا ہے۔ اگرچہ ان کا آپ سے کوئی تعلق نہ بھی ہو۔

ایک معاشرہ تبھی پنپ سکتا ہے جب اس کے ہاں چھوٹوں سے شفقت اور بڑوں کا احترام ہو۔ جہاں ان دونوں باتوں کا خیال نہ رکھا جائے اور احترام و اعزاز کے سارے آداب کو خود غرضی اور مفاد پرستی کی نظر سے دیکھا جائے تو وہ معاشرہ رحمت و برکت سے خالی نظر آتا ہے۔ محبت و شفقت دیکھنے کو نہیں ملتی اور کوئی سمجھانے والا نظر نہیں آتا۔ سب کو اپنی ہی پڑی ہوتی ہے۔ الغرض! قیامت سے پہلے قیامت کا منظر دکھائی دیتا ہے کہ اس دن بھی سب کو اپنی ہی پڑی ہوگی۔

بڑوں کے ادب کے بارے میں تعلیماتِ نبویہ

نبی کریم ﷺ کا بڑا اجلا اور واضح ارشاد ہے:

((لَیْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ یُجِلَّ کَبِیْرَنَا، وَیَرْحَمْ صَغِیْرَنَا وَیَعْرِفْ لِعَالِمِنَا حَقَّهُ)).

"وہ ہمارے طرزِ عمل پر نہیں جو ہمارے بڑوں کی قدر نہ کرے، ہمارے

چھوٹوں پر شفقت نہ کرے اور ہمارے اہل علم کا حق نہ پہچانے۔“[1]

اسی روایت کے بعض الفاظ یہ بھی ہیں:

((يُوَقِّرْ كَبِيرَنَا)).

”ہمارے بڑوں کی توقیر نہ کرے۔“

بڑوں کی قدر اور شرعی حدود و قیود میں رہ کر ان کی تعظیم و توقیر کرنا یہ مسلمانوں کا مجموعی طرز عمل ہے۔ آپ ﷺ نے اس حدیث کے ذریعے مسلم معاشرے کی عکاسی کی ہے۔

”بڑے“ سے مراد یہ نہیں کہ وہ آپ کا بوس ہو یا مینجر یا برادری کا بڑا بلکہ یہاں عمر میں بڑے لوگ مراد ہیں کیونکہ اس کے مقابلے میں چھوٹوں کے ساتھ شفقت کا ذکر بھی آیا ہے۔

دراصل چھوٹوں کے ساتھ کی ہوئی شفقت ہی بڑوں کا احترام سکھاتی ہے۔ آپ چھوٹوں سے کرخت لہجے میں، شدت بھرے انداز اور غصے بھری آواز میں بات کریں اور اس کے جواب میں ان سے توقیر و تعظیم کے منتظر رہیں تو یہ ناممکن ہے۔

بڑوں کا احترام مگر کیسے؟

نبی کریم ﷺ صحابہ کو اس نوعیت کی تعلیمات و آداب سے بھی روشناس کراتے تھے۔ رسول اکرم ﷺ نے اپنا ایک خواب بیان فرمایا:

”میں نے خواب دیکھا کہ میں مسواک کر رہا ہوں اس دوران میرے پاس دو آدمی آئے۔ ان میں سے ایک چھوٹا اور دوسرا بڑا تھا۔ میں نے اپنی مسواک ان دونوں میں سے ایک چھوٹے کو دے دی۔ مجھ سے کہا گیا کہ یہ مسواک بڑے

[1] صحيح الجامع الصغير، حديث:5443.

کو دیں، تو پھر میں نے وہ مسواک ان میں سے بڑے کو دے دی۔" [1]

نبی کریم ﷺ کا خواب وحی کا درجہ رکھتا ہے۔ اس میں جہاں مسواک کی اہمیت اجاگر ہوتی ہے وہیں بڑوں کے احترام کا انداز بھی عیاں ہوتا ہے کہ بڑوں کا احترام کیا جائے اور ان سے آغاز کیا جائے، انھیں ترجیح دی جائے۔ لیکن اگر یہ صورت ہو کہ دائیں طرف کوئی چھوٹی عمر والا ہے اور بائیں طرف بڑی عمر کے لوگ ہیں تو چھوٹی عمر والے سے اجازت لے لی جائے۔ سیدنا سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کے پاس مشروب لایا گیا۔ آپ نے پیا، آپ کی دائیں جانب ایک لڑکا تھا اور بائیں جانب بڑی عمر کے لوگ۔ آپ علیہ السلام نے لڑکے سے کہا:

((أَتَأْذَنُ لِي أَنْ أُعْطِيَ هٰؤُلَاءِ؟))

"کیا تم مجھے اجازت دیتے ہو کہ میں ان بائیں جانب والوں کو یہ دے دوں؟"

وہ لڑکا کہنے لگا:

((لَا وَاللّٰهِ! يَا رَسُولَ اللّٰهِ! لَا أُوثِرُ بِنَصِيبِي مِنْكَ أَحَدًا)).

"نہیں، اللہ کی قسم! میں آپ کی طرف سے ملنے والے اپنے حصے پر کسی کو ترجیح نہیں دوں گا۔"

تو آپ ﷺ نے وہ برتن اسے تھما دیا۔ [2]

ایک روایت میں یہ وضاحت بھی ہے کہ آپ علیہ السلام کے بچے ہوئے مشروب پر بھی کسی کو ترجیح نہیں دوں گا۔ [3]

بچے کے جذبات اپنی جگہ بڑے اہمیت کے حامل تھے۔ مگر میں یہ حدیث یہاں پر

---

[1] صحيح البخاري، حديث:246۔ [2] صحيح البخاري، حديث:2451۔ [3] صحيح البخاري، حديث:2351.

بچے کے جذبات بتانے کے لیے نہیں لایا میں تو نبی کریم ﷺ کی طرف سے بڑوں کے احترام اور ترجیح دینے کے لیے لایا ہوں۔

رسول اکرم ﷺ کی اس تعلیم وتربیت کا صحابہ رضی اللہ عنہم پر گہرا اثر تھا۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی عمر نبی ﷺ کی وفات کے وقت تقریباً 21 سال تھی مگر وہ یہ ادب آداب سیکھ چکے تھے۔ ان کا واقعہ دلچسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی۔ وہ چونکہ صاحب واقعہ ہیں اس لیے انھی کے الفاظ میں ہم واقعہ ذکر کرتے ہیں: سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ہم نبی ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ کی خدمت میں کھجور کے درخت کے سرے میں پایا جانے والا گودا ''جُمّار'' پیش کیا گیا۔ آپ علیہ السلام اسے تناول فرما رہے تھے۔ اس دوران آپ نے صحابہ سے پوچھا:

((إِنَّ مِنَ الشَّجَرِ شَجَرَةً (لَا يَسْقُطُ وَرَقُهَا) مَثَلُهَا كَمَثَلِ الْمُسْلِمِ، فَحَدِّثُونِي مَا هِيَ؟))

''درختوں میں سے ایک درخت ہے (جس کے پتے نہیں گرتے) اس کی مثال ایسے ہے جیسے ایک مسلمان کی مثال ہے۔ تو تم مجھے اس درخت کا نام بتاؤ۔''

لوگ جنگل کے درختوں کے متعلق سوچنے اور بتانے لگے۔ میرے ذہن میں آ گیا کہ وہ کھجور کا درخت ہے مگر میں سب سے چھوٹا تھا۔ مجھے شرم آ گئی تو میں خاموش رہا۔ صحابہ نے عرض کی: اللہ کے رسول! آپ ہی بتا دیجیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((هِيَ النَّخْلَةُ)).

''وہ کھجور کا درخت ہے۔''[1]

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 61 و حديث: 131.

یہ روایت جس بنا پر یہاں درج کی ہے وہ یہ ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے عمر میں چھوٹے ہونے کی وجہ سے بڑوں کی موجودگی میں درست جواب دینے میں بھی ہچکچاہٹ اور شرم محسوس کی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہاں بڑوں کے ادب و احترام کا کس قدر خیال رکھا جاتا تھا۔

نماز کی امامت کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تعلیم دی کہ

((... ثُمَّ لِيَؤُمَّكُمَا أَكْبَرُكُمَا سِنًّا)).

"پھر تم دونوں میں سے امام وہ بنے جو تم دونوں میں سے عمر میں زیادہ بڑا ہے۔"[1]

اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب دو افراد ہی تھے۔ ایک سیدنا مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ اور ایک ان کے رفیق۔ اس لیے آپ نے دو کے بارے میں بتایا، اگر دو سے زیادہ ہوں تو پھر بھی یہی ضابطہ ہے، یعنی ہر موقع پر عمر میں بڑے کو ترجیح حاصل ہے۔ ہاں! اگر کوئی شخص عمر میں چھوٹا ہے لیکن قرآن مجید میں آگے ہے تو امامت کے لیے اسے اہمیت حاصل ہے، یعنی قرآن کو اہمیت دینے کی وجہ سے باقی سب سے اس کی اہمیت بڑھ گئی۔ اس بارے میں واضح حدیث ہے:

((يَؤُمُّ الْقَوْمَ أَقْرَءُهُمْ لِكِتَابِ اللّٰهِ. فَإِنْ كَانُوا فِي الْقِرَاءَةِ سَوَاءً فَأَعْلَمُهُمْ بِالسُّنَّةِ. فَإِنْ كَانُوا فِي السُّنَّةِ سَوَاءً فَأَقْدَمُهُمْ هِجْرَةً. فَإِنْ كَانُوا فِي الْهِجْرَةِ سَوَاءً فَأَكْبَرُهُمْ سِنًّا)).

"لوگوں کی امامت وہ کرائے جو کتاب اللہ کو زیادہ پڑھنے والا ہو، اگر سارے

[1] سنن أبي داود، حديث: 589.

ہی تلاوت قرآن میں برابر ہوں، تو سنت سے زیادہ شغف رکھنے والا امامت کرائے، پھر اگر سنت کی بابت ان کا علم برابر ہو تو ہجرت میں پہل کرنے والا امامت کرائے اور ہجرت میں بھی برابر ہوں تو ان میں سے جو عمر میں بڑا ہو وہ امامت کرائے۔''[1]

یعنی متعدد امور میں لوگ ایک جیسے ہوں تو ان میں سے بڑی عمر والے کو ترجیح دی جائے۔ یہ آپ ﷺ نے ایک ضابطہ مقرر کر دیا ہے۔

اس طرح بڑوں کے ادب و احترام میں یہ شامل ہے کہ انھیں مجلس میں بولنے کا موقع دیا جائے۔ اس ضمن میں عہد نبوی کا ایک واقعہ پیش خدمت ہے۔

ہوا یوں کہ سیدنا محیّصہ بن مسعود اور عبداللہ بن سہل رضی اللہ عنہما خیبر کی طرف گئے۔ اور چلتے چلتے کھجوروں کے باغات میں ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ اس دوران عبداللہ بن سہل رضی اللہ عنہ شہید کر دیے گئے۔ محیصہ نے انھیں شہید دیکھ کر دفن کر دیا اور بعد میں عبداللہ بن سہل رضی اللہ عنہ کے بھائی عبدالرحمٰن اور ان کے چچا زاد حویصہ اور محیصہ رضی اللہ عنہم آپ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بارگاہ نبوی میں پہنچ کر عبدالرحمٰن بن سہل رضی اللہ عنہ اپنے مقتول بھائی کے حوالے سے کچھ کہنے لگے، جبکہ وہ عمر میں باقی افراد سے چھوٹے تھے۔ آپ ﷺ نے انھیں ٹوکتے ہوئے فرمایا:

((كَبِّرِ الْكُبْرَ)).

''بڑے کو کہنے کا موقع دو۔''

یا آپ ﷺ نے فرمایا:

[1] صحیح مسلم، حدیث:673.

((لِيَبْدَأِ الْأَكْبَرُ)).

''ان سے جو بڑا ہے وہ بات کا آغاز کرے۔''

پھر ان باقی دونوں نے اپنے مقتول چچا زاد کی بابت گفتگو کی۔ اور آپ ﷺ نے سماعت کی اور پھر قسامہ کا فیصلہ ہوا اور بالآخر آپ ﷺ نے اپنی طرف سے 100 اونٹوں کی دیت دی۔[1]

یہ ایک کیس کی سماعت تھی جس میں نوعمر یا کم عمر کی بجائے بڑی عمر کے افراد زیادہ صحیح بتا سکتے ہیں۔ اس لیے ایسے مواقع پر خصوصاً اور عام معاملات میں عموماً بڑوں ہی کو موقع دینا چاہیے۔ ان کی عمر بھی زیادہ ہوتی ہے، تجربات بھی زیادہ ہوتے ہیں، انھیں بات کرنے کا ڈھنگ بھی آتا ہے، حوصلے سے بات کرنے کا سلیقہ بھی زیادہ جانتے ہیں اور مقصد کی بات کرنے میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جب آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''بڑے کو موقع دو۔'' یہ الفاظ ایک مومن کی زندگی میں رچ بس جانے چاہئیں۔ اور جب بھی موقع ملے اس کی عملی صورت کا اظہار کرنا چاہیے۔

اس طرح سلام میں پہل کریں۔ حدیث نبوی ﷺ ہے:

((يُسَلِّمُ الصَّغِيرُ عَلَى الْكَبِيرِ)).

''چھوٹا بڑے کو سلام کہے۔''[2]

ادب واحترام کی مزید صورتیں

▪ آپ ڈرائیونگ کر رہے ہوں تو بڑی عمر کے کوئی شخص سامنے سے آجائیں تو آپ

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے صحیح مسلم، حدیث: 1669۔ [2] سنن أبي داود، حدیث: 5198۔ صحیح۔

اس حدیث کے پیش نظر پہلے انھیں گزرنے دیں۔

- لائن میں لگے ہیں تو بڑی عمر کے افراد کو آگے کر دیں۔
- بڑوں کو راستہ دیں۔
- بڑوں کو ترجیح دیں۔
- اگلی کرسیوں پر بٹھائیں۔
- اگلی صف میں آنے دیں۔
- بڑوں کی بات سنیں۔
- ان کے کام آئیں۔
- سفر میں بڑوں کو سیٹ دیں۔

غرضیکہ کوئی بھی موقع ہو اور بڑی عمر کے افراد یا شخصیات سے معاملہ ہو تو اسے بڑے احسن انداز سے نبھائیں۔ بڑی عمر میں مزاج میں تیزی آجاتی ہے اور غصہ بھی جلدی آتا ہے۔ لہٰذا اس صورت حال میں چھوٹی عمر والوں کو بڑے پن کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ بڑوں کے دل جیت کر ان کی دعائیں لیں اور نبی کریم، رؤف رحیم ﷺ کی اس تلقین کو ہمیشہ اپنی آنکھوں کے سامنے رکھیں:

كَبِّرْ كَبِّرْ.
''بڑے کو موقع دو۔ بڑے کو موقع دو۔''[1]

یہ الفاظ ایک مومن کے کانوں سے بار بار ٹکراتے رہنے چاہئیں۔ اور اس کے مطابق طرزِ عمل بھی ہونا چاہیے۔ پھر اس کے نتائج وہ خود ہی دیکھ لے گا۔

[1] صحيح البخاري، حديث:7192.

یہاں تک تو بات تھی نسبتاً بڑی عمر کے لوگوں کے ادب واحترام کی۔ اب ہم ان بزرگوں کا تذکرہ کرتے ہیں جو بزرگ شمار ہوتے ہیں۔

عمر رسیدہ لوگوں کا ادب واحترام

اس بارے میں نبی کریم ﷺ کی بڑی واضح تعلیمات ہیں۔ فرمان نبوی ﷺ ہے:

((إِنَّ مِنْ إِجْلَالِ اللّٰهِ إِكْرَامَ ذِي الشَّيْبَةِ الْمُسْلِمِ. وَحَامِلِ الْقُرْآنِ غَيْرَ الغَالِي فِيهِ وَالجَافِي عَنْهُ. وَإِكْرَامَ ذِي السُّلْطَانِ الْمُقْسِطِ)).

''اللہ کی تعظیم اور جلالت میں یہ بات بھی شامل ہے کہ سفید بالوں والے مسلمان بزرگوں کا اور حاملین قرآن، جو نہ تو اس میں (خودساختہ) غلو کرنے والے ہوں اور نہ ہی اس سے کنارہ کش ہوں، کا احترام واکرام کیا جائے اور عدل کرنے والے بادشاہ کا بھی احترام کیا جائے۔''[1]

اس حدیث مبارکہ میں سفید بالوں والے بزرگوں کے اکرام واحترام کو اللہ کی تعظیم اور جلالت کا حصہ قرار دیا گیا ہے۔ یہ معاشرے کے عمر رسیدہ اشخاص، خواہ وہ خواتین ہوں یا مرد حضرات ان کے اللہ کے ہاں مقام کو واضح کرتا ہے۔

سنن ابی داود کی شرح عون المعبود میں علامہ شمس الحق رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''اکرام ذی الشیبۃ المسلم'' سے مراد ہے کہ مسلمانوں کی عمر رسیدہ اور بزرگ شخصیات کی تعظیم کی جائے۔ مجلسوں میں ان کا احترام کرکے، ان سے نرمی کا برتاؤ کرکے اور ان

[1] سنن أبي داود، حديث: 4843۔ علامہ البانی رحمہ اللہ نے اسے حسن کہا ہے۔ صحيح الأدب المفرد، باب إجلال الكبير: 1/148، حديث: 357.

سے شفقت سے پیش آ کر، یہ سب اللہ تعالیٰ کی کمال تعظیم پر دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ اللہ کے ہاں ان کی حرمت ہے۔[1]

جب سفید بالوں والے بزرگوں کا اللہ تعالیٰ کے ہاں اس قدر اکرام ہے تو پھر مخلوق کے ہاں بھی ان کا ادب واحترام ہونا چاہیے۔ وہ معاشرہ مثالی معلوم ہوتا ہے جس کے بوڑھوں کی قدر کی جائے، ان کی شرم وحیا کی جائے، ان کا لحاظ رکھا جائے۔ اگر آپس میں گفتگو کر رہے ہیں تو بزرگوں کے آنے پر خاموش ہو جائیں، آواز پست کر لیں، کسی اور کام میں مگن ہیں تو وہ چھوڑ کر بزرگوں کو اہمیت دیں۔

اگر کسی بوڑھے شخص میں علم وعمل کی کمی ہے یا صفائی وطہارت کا فقدان ہے تو یہ ان کی کمی ہے۔ اس کے جواب دہ وہ خود ہوں گے۔ ہمیں تو ان کا احترام کر کے بارگاہِ الٰہی میں سرخرو ہونا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو بڑوں اور بزرگوں کا احترام کرنے کی توفیق دے۔ آمین

[1] عون المعبود، حدیثِ مذکور کے تحت۔

ادب آداب کی دینی اور معاشرتی سطح پر بڑی اہمیت ہے۔ باادب لوگوں کو بڑی عزت ملتی ہے۔ ادب سے محروم لوگ پھل نہیں پایا کرتے۔ بعض اوقات ادب سے محرومی فسق وکفر تک لے جاتی ہے۔ اس وجہ سے یہ موضوع حساس بھی ہے۔

ادب کے بہت سے پہلو اور ضابطے ہیں انہیں عام کرنے کے لیے اس موضوع کا انتخاب کیا گیا ہے۔ کتاب کے مشمولات، تحقیقی اسلوب، مستند واقعات اور سلیس انداز اسے اپنے موضوع کی دوسری کتابوں سے ممتاز کرتے ہیں۔ عجب نہیں کہ اس کے مطالعے سے ہمارا معاشرہ ادب سے سرشار اور ادب کے نام پر کی جانے والی خرافات سے پاک ہو جائے۔

مسلم پبلیکیشنز
12 عثمان غنی رضی اللہ عنہ روڈ سنت نگر، لاہور 042-37249678
25 ہادیہ حلیمہ سنٹر، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور 042-37310022